بسم اللہ الرحمٰن الرحیم

عصمتِ انبیاء

حافظ ابن حزمؒ

۳۸۴ ـــ ۴۵۶ھ

ترجمہ:

ہدایت اللہ ندوی

مین بازار، میاں چنوں، ملتان

بسم اللہ الرحمن الرحیم

معزز قارئین توجہ فرمائیں!

کتاب وسنت ڈاٹ کام پر دستیاب تمام الیکٹرانک کتب ....

- عام قاری کے مطالعے کے لیے ہیں۔
- مجلس التحقيق الاسلامی کے علمائے کرام کی باقاعدہ تصدیق واجازت کے بعد اَپ لوڈ (Upload) کی جاتی ہیں۔
- دعوتی مقاصد کی خاطر ڈاؤن لوڈ، پرنٹ، فوٹو کاپی اور الیکٹرانک ذرائع سے محض مندرجات نشرواشاعت کی مکمل اجازت ہے۔

☆ تنبیہ ☆

- کسی بھی کتاب کو تجارتی یا مادی نفع کے حصول کی خاطر استعمال کرنے کی ممانعت ہے۔
- ان کتب کو تجارتی یا دیگر مادی مقاصد کے لیے استعمال کرنا اخلاقی، قانونی وشرعی جرم ہے۔

﴿اسلامی تعلیمات پر مشتمل کتب متعلقہ ناشرین سے خرید کر تبلیغ دین کی کاوشوں میں بھرپور شرکت اختیار کریں﴾

- نشرواشاعت، کتب کی خرید وفروخت اور کتب کے استعمال سے متعلقہ کسی بھی قسم کی معلومات کے لیے رابطہ فرمائیں۔

kitabosunnat@gmail.com

1583

[illegible] 0303

بسم اللہ الرحمٰن الرحیم

تعارف

از قلم گوہر بار حضرۃ الاستاذ محمد عبدہٗ الفلاح مترجم مفردات اصفہانی
ومرتب اشرف الحواشی، شیخ التفسیر دار العلوم اثریہ۔ فیصل آباد

نام ونسب ابن حزم کا نام علی بن احمد اور کنیت ابو محمد ہے آپ ابن حزم کے لقب سے معروف ہیں۔ حزم ان کے جدِ اعلیٰ کا نام ہے، حزم کے والد کا نام غالب بن صالح ہے موصوف فارسی الاصل اندلسی قرطبی تھے۔ (المقری ج ۶ ص ۲۰۳

ابن حزم کے خاندان میں سب سے پہلے ان کے جدِ اعلیٰ یزید نے عہدِ فاروقی میں اسلام قبول کیا اور انہوں نے حضرت معاویہؓ کے بھائی یزید بن ابی سفیان سے عقدِ موالات کیا پھر جب بنو امیہ اندلس میں وارد ہوئے تو یہ خاندان بھی ان کے ساتھ اندلس میں چلا گیا اس طرح ابن حزم فارسی الاصل ہونے کے باوصف اندلسی قرطبی کی نسبت سے معروف ہو گئے (حیات ابن حزم از ابو زہرہ)

خاندانی شرافت ابن حزم نے ایک خوشحال گھرانے میں تربیت پائی۔ ان کے آباؤ اجداد وزارت وقضا کے عہدوں پر فائز رہے۔

اس بنا پر ابن حزم کو اپنی خاندانی نجابت و شرافت پر گو بڑا ناز تھا مگر انہوں نے علوم و فنون کے لئے اپنے کو وقف کر دیا اور انہی کو حصول سعادت کا ذریعہ بنایا اور ان میں ناموری اور کمال پیدا کر کے یہ ثابت کر دیا کہ اصل عزت انسان کے ذاتی علم و کمال سے ہے نہ کہ آباؤ اجداد سے۔

نشأۃ علمی

جو شخص خداداد صلاحیتوں سے بہرہ ور ہوا اور پھر مزید برآں علمی ماحول اور قابل ترین اساتذہ کی صحبت بھی میسر ہو جائے تو اس سے بڑی خوش نصیبی اور سعادت کیا ہو سکتی ہے ابن حزم کی نشأۃ علمی میں یہ تینوں اسباب کار فرما تھے اندلس کے علمی ماحول اور ذاتی صلاحیتوں کیساتھ مغرب کے مایہ ناز شیوخ نے مل کر ان کو کمالات کا مظہر بنا دیا۔

ابتداء میں مالکی فقہ سے شناسائی حاصل کی جو اس وقت اندلس میں رائج تھی اور موطا امام مالک کو باقاعدہ ضبط و اتقان سے پڑھا عبد اللہ بن یحییٰ بن دحون مالکی کی صحبت میں رہے جو اس وقت قرطبہ کے مفتی تھے پھر عبد اللہ الازدی المعروف بہ ابن الفرضی (۳۰۵ھ ۴۰۳ھ) سے حدیث و فقہ میں مہارت پیدا کی جو کہ علم حدیث اور اسماء الرجال میں ماہرانہ بصیرت رکھتے تھے اور ان کو علماء مشرق سے بھی تلمذ حاصل تھا علاوہ ازیں ابو بکر محمد بن اسحاق اور احمد بن جسور اور ہمدانی ایسے فضلاء سے بھی کسب فیض کے مواقع میسر آئے اس طرح ابن حزم نے حدیث و فقہ اور تاریخ و ادب میں کمال حاصل کر لیا۔

قرطبہ اس وقت بلاد مغرب کا دار الحکومت تھا اموی خلفاء کی علم پروری کے باعث علماء و فضلاء کا سنگم بن چکا تھا انہوں نے اسلاف کے ثمرات جہود

علمیہ کو جمع کرنے میں کوئی کسر اُٹھا نہ رکھی تھی ابن حزم نے علماء و فضلاء سے استفادہ کے علاوہ متقدمین کی کتابوں اور اُن کے ثمرات علمی سے بھی مستفید ہونے کی طرف توجہ دی جس سے ابن حزم کے ذہن میں رسوخ و پختگی پیدا ہوگئی اور ہر موضوع پر فی البدیہ گفتگو کرنے اور قلم برداشتہ لکھنے پر قادر ہوگئے ۔

مطالعہ کتب

ابو عبد الرحمٰن بقی بن مخلد سنہ ۲۷۶ھ) کی کتب سے استفادہ کیا ان کی تفسیر قرآن پڑھی جو کہ اپنے مواد کے اعتبار سے بے مثال تفسیر ہے اور ابن جریر طبری کی تفسیر سے بہتر ہے احکام القرآن ...... حجازی اور ابو الحکم منذر بن سعید کی تالیفات کو گہری نظر سے پڑھا اور پھر قاضی محمد بن یحییٰ بن مفرح کی تالیفات کا مطالعہ کیا جن میں انہوں نے فقہ حسن بصریؒ اور فقہ زہری کو مرتب کیا ہے اور فلسفہ میں محمد بن حسن مذحجی المعروف بہ ابن الکنانی کے رسائل سے استفادہ کیا اور سعید بن فتحون سرقطی المعروف بہ "الحمار" کے رسائل بھی ملاحظہ کئے ۔

ان کتب کے مطالعہ اساتذہ کی صحبت اور اپنی طبعی صلاحیتوں کی بناء پر ابن حزم نے سرزمین اُندلس میں امتیازی حیثیت حاصل کر لی اور بالآخر تصنیف و تالیف میں مشغول ہوگئے ۔

فقہ ظاہری اور ابن حزم

داؤد بن علی المتولد سنہ ۲۰۲ھ) فقہ ظاہری میں ابن حزم کے پیش رو تھے جو کہ ایک واسطے سے امام شافعیؒ کے تلمیذ تھے اور اُن کے اکثر اصحاب سے ملاقات کا شرف حاصل

کر چکے تھے۔ اُنہوں نے بغدادی محدثین سے کسب فیض کیا اور طلب علم کے لئے دوسرے شہروں کی بھی سیاحت کی۔

یہ داؤد بن علی بڑے فصیح اللسان قوی الحجۃ اور حاضر جواب تھے اپنے معتقدات کے اظہار میں کسی سے مرعوب نہ ہوتے۔ اسحاق بن راہویہ جیسے محدثین اُن کا ہدف تنقید بننے سے بھی محفوظ نہ رہ سکے عالم ہونے کے ساتھ ساتھ بڑے دانشمند اور ذی شعور بھی تھے انہی کے متعلق ان کے ایک معاصر کا قول ہے۔

"کان عقلہٗ اکثر من علمہٖ"

اُن کی قوت گویائی اور جرأت کی بنا پر ابو زرعہ رازی فرماتے ہیں:-

> اگر اہل علم کی طرح ایک خاص دائرہ میں محدود رہتے تو اپنی قوت گویائی کے بل بوتے پر اہل بدعت کا خاتمہ کر دیتے مگر وہ حد سے آگے بڑھ گئے۔

چونکہ طلب علم کے زمانہ میں امام شافعیؒ کے اصحاب تلامذہ اور محدثین سے استفادہ کر چکے تھے اس لئے ابتدائی دور میں فقہ شافعیؒ سے وابستہ رہے فقہ شافعیؒ کا یہ خاصہ ہے کہ جو شخص اس کے اصول وضوابط کا پابند ہوتا ہے وہ قرآن وحدیث اور اقوال صحابہ سے بلاواسطہ استخراج مسائل کا عادی ہو جاتا ہے داؤد بن علی میں بھی یہی میلان پیدا ہوا جس کی بنا پر وہ بھی نصوص (قرآن و سنت) سے بلاتقید استفادہ کرنے لگ گئے اور اسی کو اپنا مسلک بنا لیا چنانچہ فرماتے ہیں: شریعت کا مأخذ نصوص ہی ہیں اور بس۔

اور اس اصل کی شدت سے پابندی کی۔ کہ بالآخر ظاہری کے نام سے معروف ہو گئے۔ اور ان کے آراء و اقوال نے بھی دوسرے آئمہ کی طرح ایک مستقل مسلک کی حیثیت اختیار کر لی۔ انہوں نے اپنے آراء و اقوال کی تائید میں بہت سے اصول وضع کئے۔ اور کتابیں بھی تالیف کیں۔ جن کی بنا پر اس مسلک کو زندہ و تابندہ رہنے کے مواقع میسر آئے۔

داؤد ظاہری حریت فکر و نظر کے علم بردار تھے۔ جب کہ اُن کے بالمقابل دوسرے فقہی مکاتب خیال میں جمود پیدا ہو چلا تھا۔ اس بنا پر چوتھی صدی ہجری میں ظاہری فقہ کو بھی دوسرے فقہی مکاتب خیال کی حیثیت حاصل ہو گئی۔ اور بلادِ شرق میں اسے بہت فروغ حاصل ہوا۔ اور اس دور کے بڑے بڑے علماء نے اس مسلک سے وابستگی اختیار کر لی۔

یوں تو تیسری صدی ہجری میں ہی بعض علماء مغرب نے علماء مشرق سے متاثر ہو کر مغرب میں ایسے آزاد افکار کا پرچار شروع کر دیا تھا۔ جن کی بنیاد خالصتہً قرآن و سنت اور اقوال صحابہ پر تھی۔ اور کسی فقہی مسلک کی پابندی نہ تھی۔ جن میں سے بقی بن مخلد، ابن وضاح اور قاسم بن اصبغ خاص طور پر قابل ذکر ہیں۔ ان علماء کے خیالات و افکار نے مغرب میں مالکی فقہ کے تسلط کو ختم کر کے استنباط مسائل کی بنیاد حریت فکر پر رکھی جو بعد میں ظاہری فقہ کے لئے سنگ میل ثابت ہوئی۔ حتیٰ کہ چوتھی صدی میں قاضی منذر بن سعید بلوطی ۳۵۵ھ جیسی شخصیت اس مسلک کی حامی اور مددگار بن گئی۔ اور کچھ دوسرے علماء بھی ظاہریت کو فروغ دینے لگے

ابن حزم قاضی منذر کے خیالات سے بے خبر نہ تھے۔ اور ان کے بیٹے سعید بن منذر (سنہ ۴۰۳ھ) سے بھی ملاقات کر چکے تھے۔ اور پھر ابن حزم ابُو الخیار مسعود بن سلیمان (سنہ ۴۶۶ھ) سے فقہ ظاہری کا درس حاصل کر چکے تھے۔ اور دُوسرے علماء کے خیالات اور تالیفات سے آگاہ تھے۔ جو کسی خاص فِقہی مسلک کے پابند نہ تھے۔ اِن جملہ اسباب و دواعی کی بنا پر ابن حزمؒ نے اپنے دَور (سنہ ۵۰۰ھ) میں فِقہ ظاہری کا علَم بلند کیا۔ جب کہ اِن کے معاصر قاضی ابو یعلیٰ، مشرق میں فقہ حنبلی کو فروغ دینے میں مشغول تھے۔

ابن حزم کے اُصول

فقہ ظاہری کی بنیاد و اساس ظاہر کتاب و سُنّت اور اجماعِ صحابہ پر ہے۔ اور کسی مذہب کے ساتھ تقیّد اور اُس کی تقلید نہیں۔ بلکہ فقہاء کے اقوال میں ترجیح و اختیار ہے۔ یہی دو اُصول ہیں جن پر محدّثین نے فقہ الحدیث کی بنیاد رکھی ہے۔ اِس بنا پر ہم کہہ سکتے ہیں کہ فقہ ظاہری اپنے مادہ اور مخصوص ہیئت کذائی کے اعتبار سے فقہ الحدیث یعنی محدّثین کی فقہ کا چربہ ہے۔ مگر بعض قواعد اور تفریعات میں "فقہ الحدیث" سے ممتاز ہے۔

ابن حزم نے ظاہری فقہ کی بنیاد چار اُصول قرار دیے ہیں۔

(۱) کتاب اللہ (قرآن کریم)
(۲) حدیث رسول اللہؐ (یہ بھی وحی کا ایک حِصّہ ہے)
(۳) علمائے اُمّت کا اجماع

(۴) اِن میں سے کوئی دلیل جس میں صرف ایک ہی احتمال پایا جاتا ہو۔ (احکام ج ۱

تشریح و وضاحت

اب اِن اصول اربعہ پر غور کیجئے۔ جو فقہ اسلامی کے مصادر و مآخذ ہیں۔ قرآن و حدیث ایک دوسرے کے مؤید ہیں۔ قرآن سے اجماع کی حجیّت ثابت ہوتی ہے۔ (و یتبع غیر سبیل المومنین) اور جب اِن تینوں سے کسی حکم کی بنیاد و اساس ثابت ہو گی اور اس سے ہم کسی حکم کا استخراج کریں گے۔ تو یہ اصل چہارم ہے۔ اور فقہ ظاہری میں اس کا نام دلیل ہے۔

ابن حزم فرماتے ہیں۔ اِن اصول میں اصل الاصول کی حیثیت کتابُ اللہ کو حاصل ہے۔ کتاب اللہ نے چونکہ سنت اور اجماع کو حجت اور واجبُ الاتباع قرار دیا ہے۔ اس پر بھی عمل ضروری ہے۔ اور پھر اِن تینوں سے بالاتفاق جو معنی، حکم کی اساس قرار پائیگا۔ اسی سے احکام کا استخراج ہو سکے گا اور اس کا نام دلیل ہے جس کی بنیاد اصول ثلاثہ پر ہے۔

ابن حزمؒ اس کی تفصیل بیان کرتے ہوئے لکھتے ہیں۔

"قرآن حدیث سے جو احکام ماخوذ ہیں۔ وہ تین قسم پر ہیں۔

(ا) وہ احکام جن کو اُمت نسلاً عصراً بعد عصرٍ نقل کرتی چلی آئی ہے۔ مثلاً ایمان، نماز، روزہ اور حج، اس کو اجماع اُمت سے تعبیر کرتے ہیں۔

(ب) وہ احکام جو تواتر منقول ہیں مگر ان پر اجماع منعقد نہ ہوا۔ مثلاً آنحضرتؐ کا صحابہ کے روبرو بیٹھ کر نماز ادا کرنا یا خیبر کی اراضی کو آدھی پیداوار

کے عوض یہود کے سپرد کر دینا۔

ج) تیسری قسم احکام کی وہ ہے۔ کہ ایک ثقہ راوی دوسرے ثقہ راوی سے روایت کرے۔ اِن میں سے بعض احکام پر اجماع منعقد ہوتا ہے اور بعض میں اختلاف ہوتا ہے۔ (احکام ج ۴ ص ۱۴۲)

پہلی قسم کے احکام کو ابن حزمؒ اجماعی احکام سے تعبیر کرتے ہیں۔ یہی نقطۂ نظر امام شافعیؒ کا ہے۔ وضعِ اُصول میں امام شافعیؒ ان کے پیشرو ہیں۔ اور یہ اجماع صرف صحابہ کرام کا اجماع ہے۔ اور مصدر رابع کا نام دلیل ہے۔ دلیل اور قیاس میں واضح فرق ہے۔ قیاس کی بنیاد تو اِس علت پر ہے۔ جو قرآن و سنت یا نص سے نکالی جاتی ہے۔ مگر دلیل براہِ راست نص و اجماع کی ذات سے اخذ کی جاتی ہے۔ ابن حزم نے وضاحت کے طور دلیل کی سات اقسام قرار دی ہیں۔

۱۔ مثلاً نص صغریٰ، کبریٰ پر مشتمل ہو اور نتیجہ مذکور نہ ہو۔ تو اس صورت میں استخراج نتیجہ کو دلیل سے تعبیر کرتے ہیں جیسے کل خمرٍ مسکر وکل مسکرٍ حرامٌ، فالخمر حرامٌ (بدلیل النص)

تالیفات

ابن حزم کی تالیفات سے پتہ چلتا ہے۔ کہ انہوں نے اپنے فکر و نظر اور مطالعہ کو محدود نہیں رکھا تھا۔ بلکہ ایک طرف اگر وہ زبردست محدث اور فقیہ تھے۔ تو دوسری طرف بڑے پایہ کے مؤرخ، جلیل القدر ادیب اور شاعر بھی تھے۔ اُن کے علم و فضل اور عرفان کے ہر گوشے کو اُجاگر کرنے کے لئے ایک دفتر درکار

ہے۔ ان اوراق میں ہم صرف ان کی تالیفات کی فہرست پیش کر کے اصل موضوع پر کچھ روشنی ڈالنا چاہتے ہیں۔

۱۔ الفصل فی الملل والاہوا والنحل
۲۔ کتاب الصادع والرادع
۳۔ شرح موطأ امام مالک
۴۔ کتاب الجامع فی الصحیح الحدیث
۵۔ کتاب التلخیص فی المسائل النظریہ
۶۔ کتاب منتقی الاجماع
۷۔ الامامۃ والسیاسۃ
۸۔ اخلاص النفس
۹۔ الایصال الی فہم کتاب الخصال
۱۰۔ کشف اللباس ما بین اصحاب الظواہر واصحاب القیاس
۱۱۔ جمہرۃ الانساب
۱۲۔ المفاضلۃ بین الصحابۃ
۱۳۔ الناسخ المنسوخ
۱۴۔ مداواۃ النفوس
۱۵۔ نقط العروس
۱۶۔ الاحکام فی اصول الاحکام ۔ ۱۸۔ طوق الحمامہ
۱۷۔ المحلی ۹۔ کتاب التقریب (منطق)

ابن حزمؒ نے اور بھی بہت سی تالیفات کی ہیں۔ جو زمانہ کی دستبرد سے محفوظ نہیں رہ سکیں۔ ہم یہاں پر صرف "الفصل" کے باب عصمت الانبیاء پر کچھ عرض کریں گے۔ جس کا ترجمہ ناظرین کے سامنے ہے۔

واضح رہے۔ کہ ابن حزمؒ کی آراء میں تفرد پایا جاتا ہے۔ اور اُنہوں نے کسی بات میں دوسروں کی تقلید کو گوارا نہیں کیا۔ حتیٰ کہ علم و ادب اور اسلوب نگارش میں بھی ابن حزمؒ نے دوسروں کے طریق پر چلنا گوارا نہیں کیا۔ چنانچہ وہ خود فرماتے ہیں۔

وَمَا مذہبی اِن الضحی مطیۃ سوادی وَلا اَن التحلی بحلی مستعار

اور ایک عبقری ہمیشہ یہی روش اختیار کرتا ہے۔ اس رسالہ میں بھی ناظرین کو یہی تفرد نظر آئیگا۔ لیکن اپنے زور استدلال سے دوسروں کی دلیل کو ان کے خلاف قائم کرنے میں کامیاب نظر آتے ہیں۔

ان کی "الفصل" تاریخ مذاہب پر بے نظیر کتاب ہے۔ اس کتاب میں مؤلف نے اسلامی فرقوں کی تاریخ بیان کرتے ہوئے اُن کے اُصول و قواعد پر نقد و تبصرہ بھی کیا ہے جس کے مطالعہ سے متکلمین کے "فرق اربعہ" کے متعلق اہم معلومات اور ان کے عقائد کا پس منظر سامنے آجاتا ہے۔

اس کتاب میں مؤلف نے علم کلام کے اہم مسائل پر بڑی تفصیل سے بحث کی ہے۔ اور سلف کے مسلک کو واضح کیا ہے۔ مثلاً مسئلہ خلق قرآن، قدر و استطاعت، خلق افعال، عدل و جور، مشیئت الٰہی وغیرہا

ایسے اہم مسائل پر عقلی اور نقلی دلائل سے روشنی ڈالی ہے۔ کہ علم کلام میں اہلسنت اور محدثین کا مسلک نِتھر کر سامنے آجاتا ہے۔

ان مسائل میں سے ایک مسئلہ عصمت انبیاءؑ بھی ہے۔ یعنی کیا انبیاءؑ سے معصیت باری تعالیٰ کا صدور ممکن ہے۔ اور اگر ممکن ہے تو کیا تبلیغ ورسالت میں بھی ان سے جھوٹ صادر ہو سکتا ہے۔ اس مقالہ میں ابن حزمؒ نے مسئلہ زیر بحث کے تمام پہلوؤں پر بحث کی ہے۔ اور قرآن وحدیث میں اس مسئلہ کے متعلق جس قدر آیات واحادیث سے مخالفین نے استمساک کیا ہے۔ ایک ایک کرکے ان کا جواب دیا ہے۔ بہرحال ابن حزمؒ کا یہ مقالہ مطالعہ کے قابل ہے۔ ہماری جماعت کے بزرگ مولانا میر سیالکوٹی کے پاس جو طالب علم تفسیر قرآن کے لئے جاتے، مولانا مرحوم خصوصیت کے ساتھ اپنی زیر نگرانی "الفصل" سے یہ بحث ذہن نشین کرواتے کیونکہ تفسیر قرآن میں یہ بحث نہایت اہم ہے۔ اور امام رازیؒ نے بھی اپنی تفسیر میں متعلقہ مقامات پر اس کی خوبصورت وضاحت کی ہے۔ مگر رازی وغیرہ پر چونکہ عقلیات کا غلبہ ہے۔ اس لئے وہ کلامی مسائل میں اشاعرہ کی ترجمانی تو کرسکے ہیں۔ مگر محدثین کے مسلک کو کماحقہ واضح نہیں کرسکے۔ اس بنا پر ہمارے اہلحدیث علما اور طلبہ کو خاص طور پر اس قسم کی کتابوں کے مطالعہ کی ضرورت ہے۔ دعا ہے کہ اس دور پرفتن میں اللہ تعالیٰ ہمیں سلف کے مسلک پر چلنے اور ثابت قدم رہنے کی توفیق عنایت فرمائے۔ وما توفیقی الا باللہ

بسم اللہ الرحمٰن الرحیم

نحمدہ ونصلی علی رسولہ الکریم

کیا انبیاء علیہم السلام معصیت کا ارتکاب کرتے ہیں؟

تبلیغ میں دروغ گوئی

عصمت انبیاء علیہم السلام میں اختلاف ہے ایک گروہ کا خیال ہے۔ کہ انبیاء علیہم السلام "معاذ اللہ" تمام صغائر وکبائر کا عمداً ارتکاب کرتے ہیں۔ صرف تبلیغ میں دروغ گوئی سے اجتناب کرتے ہیں۔ یہ مسلک یہود ونصاریٰ کرامیہ ابن طیب باقلانی ۴۰۳ھ اور اس کے متبعین کا ہے۔ بلکہ کرامیہ کے متعلق یہ بھی سنا ہے۔ کہ وہ انبیاء سے تبلیغ میں بھی کذب بیانی کو روا سمجھتے ہیں۔

ابوجعفر سمنانی ۴۴۴ھ تلمیذ باقلانی اپنی کتاب "الامامۃ" میں رقمطراز ہے۔ کہ تبلیغ میں کذب بیانی کے بغیر انبیاء علیہم السلام سے تمام چھوٹے بڑے گناہ سرزد ہو سکتے ہیں۔ بلکہ اُن سے کفر بھی ممکن ہے۔ اور جب کوئی نبی کسی چیز سے منع کرے۔ اور پھر وہ خود اس کا ارتکاب کرے۔ تو اس کا یہ فعل "نہی" کے نسخ کی دلیل نہ ہوگا۔ کیونکہ نبی بھی کبھی اللہ تعالیٰ کی معصیت کرتا ہے۔ نیز امت محمدیہ میں آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم کی بعثت تا وفات کے درمیانی عرصہ میں ممکن ہے آپؐ سے کوئی افضل ہو"

ابن حزم کا تبصرہ

یہ سب خالص کفر و شرک، ارتداد اور اسلام سے انحراف ہے۔ ایسا عقیدہ رکھنے والے کا جان و مال مباح ہے۔ اور اس سے بیزاری اور برأت کا اظہار ضروری ہے ابن فورک اشعری وغیرہ کا یہ مسلک ہے۔ کہ انبیاء علیہ السلام سے کبائر کا ارتکاب بالکل نہیں ہوتا۔ البتہ ارادةً صغائر سرزد ہو سکتے ہیں۔ اہل سنت ، شیعہ، معتزلہ، خوارج، اور نجاریہ کا یہ مسلک ہے کہ انبیاء علیہم السلام سے "ارادۃً" کوئی صغیرہ و کبیرہ گناہ سرزد نہیں ہو سکتا اور یہی مسلک ابن مجاہد اشعری کا ہے جو باقلانی اور ابن فورک کے استاد ہیں۔ اسی اعتقاد کو ہم اللہ تعالیٰ کا دین تصور کرتے ہیں۔ اس کے خلاف عقیدہ رکھنا بالکل روا نہیں۔

سہو و نسیان

ہاں انبیاء علیہم السلام سے بلا ارادہ۔ سہواً کوئی فعل سرزد ہو سکتا ہے۔ اور کبھی ایسا بھی ہوتا ہے۔ کہ وہ کسی فعل سے اللہ تعالے کی رضا اور تقرب کا ارادہ کرتے ہیں۔ مگر وہ فعل غیر شعوری طور پر رضا الٰہی کے خلاف واقع ہوتا ہے

فوری اطلاع

لیکن اللہ تعالیٰ انبیاءؑ کو ان دونوں صورتوں سہو اور خلاف "رضا الٰہی" پر قائم نہیں رکھتا۔ بلکہ فوراً انہیں اس پر آگاہ کر دیتا ہے۔ اور خوب واضح کر دیتا ہے۔ کہ دوبارہ یہ فعل ان سے سرزد اور صادر نہ ہو۔ جیسا کہ نبی علیہ السلام نے سہواً دو رکعت پر ایک بار سلام پھیر دیا۔ اور چار پوری نہ پڑھیں۔ اور ایک

دفعہ تشہد بھول گئے ۔ دوسری رکعت کے بعد بلا تشہد اٹھ کھڑے ہوئے اور کبھی انبیاء علیہم السلام کو اُن کی کوتاہی اور لغزش پر سرزنش اور تنبیہ بھی ہوتی ہے ۔ جیسا کہ حضرت زینبؓ اور زیدؓ کے واقعہ طلاق اور حضرت ابن ام مکتوم کے قصہ میں ہوا ۔

کبھی انہیں ناپسندیدہ امر کا خمیازہ دنیا میں بھی برداشت کرنا پڑتا ہے ۔ جیسا کہ حضرت آدمؑ اور یونسؑ علیٰ نبینا وعلیہم السلام مصیبت میں مبتلا ہو گئے ۔

منصب نبوت

اس باب میں انبیاءؑ کا حال ہم سے مختلف ہے ۔ کیونکہ سہو و نسیان پر ہم سے کوئی گرفت اور جواب طلبی نہیں ہوتی ۔ اور اُس کوتاہی پر ہم سے کوئی مؤاخذہ اور باز پُرس نہیں ہوتی ۔ جسے ہم رضائے الٰہی کی خاطر کریں ۔ لیکن وہ رضائے الٰہی کے خلاف واقع ہو جائے ۔ بلکہ ہم اُمتیوں کو ایسی صورت میں ایک اجر بھی ملتا ہے ۔

رسول اللہ صلعم نے فرمایا کہ اللہ تعالیٰ نے شیطان کو ہر ایک انسان کا رفیق اور قرین بنایا ہے ۔ لیکن اللہ تعالیٰ نے میری مدد فرمائی ہے ۔ کہ میں اس کے شر سے محفوظ و مامون رہتا ہوں ۔

سہو و نسیان اور صغائر و کبائر سے فرشتے پاک ہیں ۔ کیونکہ اُن کی پیدائش نورِ خالص سے ہوئی ہے جس میں کثافت کی کوئی آمیزش نہیں ۔ وہ نورًا اور پیکر خیر ہیں ۔ اُن میں تاریکی اور ظلمت کو ذرہ برابر دخل نہیں ۔

حضرت عائشہؓ بیان کرتی ہیں کہ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا "فرشتے نور سے پیدا ہوئے ہیں جن آگ کے شعلے سے اور انسان مشت خاک سے۔

منکرین عصمت انبیاءؑ نے جن آیات و احادیث کو بطور استدلال پیش کیا ہے۔ ہم انشاء اللہ بدلائل اُن کا جواب دیں گے۔ اور براہین قاطعہ سے اُن کی غلطیاں بے نقاب کرینگے۔

آدم علیہ السلام کی عصمت کا بیان

منکرین عصمت انبیاءؑ نے آدم علیہ السلام کے بارے میں ان آیات کو بطور حجت پیش کیا ہے۔

آدمؑ نے اپنے پروردگار	عَصٰی آدَمُ رَبَّهٗ فَغَوٰی
کے حکم کے خلاف کیا تو اپنے	ثُمَّ اجْتَبَاهُ رَبُّهٗ فَتَابَ
مطلوب سے بے راہ ہو گئے۔	عَلَيْهِ وَهَدٰی (طٰہٰ ۱۲۱)

پھر انہیں پروردگار نے نوازا۔
تو ان پر مہربانی سے توجہ فرمائی اور سیدھی راہ بتلائی۔

اس سے معصیت کا ارتکاب اور بے راہروی ثابت ہے۔ نیز توبہ گناہ ہی سے ہوتی ہے۔

اس درخت کے پاس نہ جانا	وَلَا تَقْرَبَا هٰذِهِ الشَّجَرَةَ
نہیں تو ظالموں میں داخل ہو جاؤ گے	فَتَكُوْنَا مِنَ الظّٰلِمِيْنَ (بقرہ ۳۵)

آدم علیہ السّلام شجرۂ ممنوعہ کے پاس گئے۔ لہٰذا ظلم ہوئے۔
پس پھسلا دیا شیطان نے اُن کو اور فَاَزَلَّهُمَا الشَّيْطٰنُ عَنْهَا
وہاں سے اُن کو نکال باہر کیا۔ فَاَخْرَجَهُمَا مِمَّا كَانَا فِيْهِ (۲/۴)
شیطان کا اِزلال اور لغزش معصیت ہے۔
پس دیا جب اُن کو تندرست تو فَلَمَّآ اٰتٰهُمَا صَالِحًا جَعَلَا لَهٗ
بچے" ہیں جو انکو دیتا ہے اس کا شُرَكَآءَ فِيْمَآ اٰتٰهُمَا (ع/۱۹)
شریک مقرر کرتے ہیں

عِصیان کا مفہوم

یہ سب دلائل ان کے ظن اور ادعا کے خلاف ہیں۔ کیونکہ " عَصٰۤى اٰدَمُ رَبَّهٗ فَغَوٰى " میں عصیان آدم کا مطلب یہ ہے۔ کہ حاکم کے حکم کی خلاف ورزی بظاہر حال " معصیت " ہے لہٰذا اِس کا نام بھی بظاہر معصیت و بے راہروی ہوا۔ لیکن جو معاصی اور گناہ قصدًا اور ارادۃً سرزد ہوں۔ وہ درحقیقت معصیت ہوتے ہیں۔ کہ اِس میں معصیت کا قصد ہوتا ہے۔ اور اِس کا علم ہوتا ہے۔ اور ایسی ہی معصیت سے ہم انبیاء کو پاک اور معصوم سمجھتے ہیں۔

بعض گناہ جو" حکم کے خلاف" قصد و ارادہ سے سرزد ہوتے ہیں لیکن گناہگار اِس میں خیر کی نیت رکھتا ہے۔ اور اُس کو معصیت نہیں سمجھتا۔ بلکہ بزعم خویش اللہ تعالیٰ کا مطیع و فرمانبردار ہوتا ہے۔ یا یہ کہ

وہ فعل اِس کے لئے مباح ہے اِس لئے وہ تاویل کرتا ہے ۔ کہ وہ " حکم " جس کا وہ مامور ہے ۔ وہ بطورِ وجوب اور تحریم نہیں بلکہ " وہ " اگر بصیغہ امر ہے ۔ تو استحباب پر محمول کرتا ہے ۔ اگر بصیغہ نہی ہے ۔ تو کراہت پر محمول کرتا ہے ۔ ایسی تاویلی معصیت میں علماء و فقہاء بکثرت مبتلا ہیں ۔ اور یہی تاویلی معصیت انبیاء سے سرزد ہوتی ہے ۔ اور اُن کی جواب طلبی اور گرفت ہوتی ہے ۔ اور اِسی تاویل و توجیہ سے حضرت آدم علیہ السلام نے " شجرہ ممنوعہ کا پھل کھا

ظلم کا مفہوم

اِس آیت میں " ظالمین " سے مراد اپنی ذات پر ظلم کرنے والے ہیں ۔ کیونکہ ظلم کا لغوی معنیٰ " وَضْعُ الشَّیْئِ فِیْ غَیْرِ مَوْضِعِہٖ " کسی چیز کا نامناسب جگہ پر رکھنا ، لہٰذا جس نے امر و نہی کو استحباب اور کراہت کے معنی میں سمجھا ۔ تو اُس نے " شیئ " کو غیر موزوں جگہ میں رکھ دیا ۔

حضرت آدم علیہ السلام کا ظلم اِسی نوع کا ہے ۔ جو بلا عزم و ارادہ صادر ہوا ۔ اور معصیت نہیں ۔ یہ وہ ظلم نہیں جو معصیت کے ارادے سے ہو ۔ اور مرتکب کو اِس فعل کے معصیت ہونے کا علم بھی ہو ۔

اِس امر کی دلیل یہ ہے ۔ جس کی اللہ تعالےٰ نے حضرت آدم کے قصہ میں تصریح فرمائی ہے ۔ کہ حضرت آدم علیہ السلام نے ابلیس کے حلفیہ بیان ہی کے بعد اِس درخت کا پھل کھایا ۔ کہ یہ نہی " تحریمی

نہیں۔ اور وُہ اِس پھل کے کھانے سے قطعاً کسی سزا کے سزاوار نہ ہونگے
بلکہ جزائے خیر اور عیشِ دوام کے مستحق ہونگے۔

اللہ تعالیٰ نے شیطان کا یہ حلفیہ بیان قرآن پاک میں بیان
فرمایا ہے۔

شیطان نے کہا۔ تمہیں تمہارے قَالَ مَا نَهٰكُمَا رَبُّكُمَا عَنْ هٰذِهِ
پروردگار نے اِس درخت الشَّجَرَةِ اِلَّآ اَنْ تَكُوْنَا مَلَكَيْنِ اَوْ
سے اِس لیے منع کیا ہے کہ تم تَكُوْنَا مِنَ الْخٰلِدِيْنَ وَقَاسَمَهُمَا
فرشتے بن جاؤ۔ یا اِس میں اِنِّيْ لَكُمَا لَمِنَ النّٰصِحِيْنَ فَدَلّٰهُمَا
ہمیشہ رہنے والے ہو جاؤ، بِغُرُوْرٍ (۷/۲۱)
اور اُس نے قسم کھا کر کہا کہ میں تمہارا خیر خواہ ہوں۔ اور انکو فریب سے پھسلا دیا۔
اور ہم نے قبل ازیں آدمؑ سے عہد وَلَقَدْ عَهِدْنَا اِلٰٓى اٰدَمَ مِنْ قَبْلُ وَ
لیا تھا مگر وہ اُسے بھول لَمْ نَجِدْ لَهٗ عَزْمًا ۲۰/۱۱۵
گئے۔ اور ہم نے اُن میں پختہ یقین اور ثبات نہ دیکھا۔

جب آدم علیہ السّلام ابلیس کی عداوت کو بھول گئے جس سے
اللہ تعالیٰ نے انہیں پہلے ہی آگاہ فرما دیا تھا۔ تو اِسکی قسم پر اعتماد کر لیا
گناہ کے ارادے سے محفوظ اور اُس کا اقدام کرنے سے باز رہنے
کی نسبت کسی شخص کی قسم پر اعتماد کرنا۔ کہ وہ جھوٹی قسم نہیں کھا سکتا۔
کہیں زیادہ قابل تعریف و ستائش ہے۔

حضرت آدم علیہ السّلام سے یہی ہوا۔ کہ "شجر ممنوعہ" سے سہو و

نسیان یا تاویل اور ارادۂ خیر سے اُس کا پھل کھالیا ۔ ان کا اندازہ تھا کہ اللہ تعالےٰ کے ہاں اُن کا رُتبہ بلند ہو جائے گا ۔ کہ ان کا شمار مقرّب ملائکہ میں ہوگا ۔ یا انہیں یہ نعمت تا اَبد حاصل ہو جائیگی اِس تصور نے انہیں حکم کی خلاف ورزی کی طرف دھکیل دیا ۔

حضرت آدمؑ کو چاہیئے تھا ۔ کہ حکم الٰہی کو ظاہر پر محمول کرتے انہوں نے "خیر" کے ارادے سے تاویل و توجیہہ کی ۔ مگر وہ تاویل درست ثابت نہ ہوئی ۔

اگر کوئی عالم دین ایسا کرے تو وہ اجر کا مستحق ہوگا ۔ لیکن حضرت آدم علیہ السلام نے ایسا کیا ۔ اور اس کی پاداش میں جنت سے نکل کر دُنیا کی صعوبتیں برداشت کیں ۔ تو اپنی ہی ذات کے لئے "ظالم" بنے ۔

ظالم کی وجہ تسمیہ

اللہ تعالیٰ نے غلطی سے قتل کرنے والے کو بھی "قاتل" ہی کے نام سے موسوم کیا ہے ۔ جیسے ارادۃً قتل کرنیوالے کو "قاتل" کہا جاتا ہے حالانکہ غلطی سے قتل کرنیوالے کا ارادہ معصیت کا نہ تھا ۔

"قتلِ خطا" میں غلام کا آزاد کرنا کفارہ مقرر کیا ۔ اور جس کو یہ ممکن نہ ہو ۔ وہ پیہم دو ماہ کے روزے رکھے ۔ حالانکہ اُس نے قصد و ارادہ سے جرم کا ارتکاب نہیں کیا تھا ۔

لہذا اگر تو ہمیں تندرست لَئِنْ اٰتَیْتَنَا صَالِحًا لَّنَكُونَنَّ مِنَ الشّٰكِرِيْنَ

بچہ عطا کردے۔ تو ہم تیرے فَلَمَّا آتَاهُمَا صَالِحًا جَعَلَا لَهُ شُرَكَاءَ
شکرگزاروں میں سے ہونگے فِيمَا آتَاهُمَا (۷/۱۹۰)
پس جب دیا۔ اُن کو تندرست تو اُس "بچے" میں جو اُن کو دیا ہے اس کا شریک مقرر کرتے ہیں۔

مذکورہ بالا آیت کا مصداق حضرت آدمؑ کو سمجھنا اُن کی تکفیر کا باعث ہے۔ اور جو شخص آدم علیہ السلام کی طرف شرک اور کفر کی نسبت کرے۔ وہ بالاتفاق رائے خود مشرک و کافر ہے۔

ہم تو قاتل، گنہ گار، بدمعاش اور فاسق مسلمان کو کافر کہنے پر اعتراض کرتے ہیں۔ انبیاء کی تکفیر کرنے والا قابل اعتراض کیونکر نہ ہوگا۔

قصہ عبدالحارث

یہ قصہ جو حضرت آدم علیہ السّلام کی طرف منسوب ہے۔ کہ شیطان کی انگیخت سے آدمؑ نے اپنے لڑکے کا نام "عبدالحارث" رکھ دیا تھا۔ بالکل من گھڑت اور جھوٹا ہے۔ کسی بے حیا اور بیدین کا خودساختہ ہے۔ اس کی سند قطعاً درست نہیں۔ دراصل اس آیت کے مخاطب مشرکین ہیں۔ بفرض محال اگر آدمؑ کے بارے میں یہ آیت نازل ہوئی ہو۔ تو بھی منکرین عصمت کے لئے کوئی مفید مطلب مواد موجود نہیں۔

آیت مذکور میں "شرکاء" اور "شرک" وہ شرک نہیں جس

کے ڈانڈے کفر کے ساتھ ملے ہوئے ہوتے ہیں۔ بلکہ وہ شرک اِس معنیٰ میں ہے۔ کہ انہوں نے اللہ پر اعتماد اور توکل کے ساتھ ساتھ اپنی حفاظت کو بھی شریک بنا دیا۔

یعقوبؑ سے مماثلت

اِس آیت کا وہی مفہوم ہو گا۔ جو حضرت یعقوبؑ نے درج ذیل آیت سے مراد لیا تھا

یٰبَنِیَّ لَا تَدْخُلُوا مِنْ بَابٍ وَّاحِدٍ وَّادْخُلُوْا مِنْ اَبْوَابٍ مُّتَفَرِّقَةٍ وَمَا اُغْنِیْ عَنْکُمْ مِّنَ اللّٰهِ مِنْ شَیْءٍ اِنِ الْحُکْمُ اِلَّا لِلّٰهِ، عَلَیْهِ تَوَکَّلْتُ وَعَلَیْهِ فَلْیَتَوَکَّلِ الْمُتَوَکِّلُوْنَ وَلَمَّا دَخَلُوْا مِنْ حَیْثُ اَمَرَهُمْ اَبُوْهُمْ مَا کَانَ یُغْنِیْ عَنْهُمْ مِّنَ اللّٰهِ مِنْ شَیْءٍ اِلَّا حَاجَةً فِیْ نَفْسِ یَعْقُوْبَ قَضٰهَا ۱۲

اے میرے بیٹو! ایک ہی دروازہ سے داخل نہ ہونا۔ بلکہ جدا جدا دروازوں سے داخل ہونا۔ اور میں خدا کی تقدیر کو تو روک نہیں سکتا۔ بیشک حکم اسی کا ہے۔ میں اُسی پر بھروسہ رکھتا ہوں اور اہل توکل کو اُسی پر بھروسہ رکھنا چاہیئے۔ اور جب وہ داخل ہوئے اُن مقامات سے جہاں سے باپ نے انہیں کہا تھا۔ تو وہ تدبیر خدا کے حکم کو ذرا بھی ٹال نہیں سکتی تھی۔ ہاں وہ یعقوبؑ کے دل کی خواہش تھی۔ جو انہوں نے پوری کی تھی۔

اِس آیت میں اللہ تعالیٰ نے یہ فرمایا ہے۔ کہ حضرت یعقوبؑ نے اُن کو متفرق دروازوں سے داخل ہونے کا حکم صرف شفقت پدری اور محبت کے تقاضے کے پیش نظر دیا تھا۔ نظر بد کے خیال سے یا دشمن کے روک ٹوک سے یا اُن کے غیر معمولی اجتماع کے خطرہ سے یا کسی اور اندیشہ سے۔

حضرت یعقوبؑ اِس بات کے معترف ہیں۔ کہ اُن کا یہ مشورہ اور اندیشہ اُن سے قضاءِ الٰہی کو نہیں ٹال سکتا۔ دیگر انبیاء کی طرح حضرت یعقوب علیہ السلام میں بھی بشری تقاضے موجود تھے۔ جیسے اللہ تعالیٰ نے خود انبیاء کا اعتراف قرآن پاک میں بیان فرمایا ہے۔ کہ "اِنْ نَّحْنُ اِلَّا بَشَرٌ مِّثْلُكُمْ" ہم تمہاری طرح کے بشر ہیں۔ لہٰذا اِن بشری تقاضوں نے اُن کو محبوب کی عافیت کی آرزو پر آمادہ کیا۔ اگرچہ اُن کا یہ احتیاط و تحفظ کسی آفت سے ان کو بچا نہیں سکتا تھا۔ جیسے آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم نیک فال کو پسند فرمایا کرتے تھے۔

بنا بریں آیت مذکور میں شرک کا "مفہوم" حفاظت و صیانت اور تعویذ، گنڈا وغیرہ ہوگا۔۔۔ کیونکر نہیں؟ حالانکہ آیت صرف کفار کے بارے میں نازل ہوئی ہے۔ حضرت آدم علیہ السلام سے اس کا سرے سے کوئی تعلق ہی نہیں۔

حضرت نوح علیہ السلام

منکرینِ عصمت نے نوح علیہ السلام کے خلاف عصمت میں یہ آیت نقل کی ہے۔

تو جس کی حقیقت معلوم فَلَا تَسْئَلْنِ مَا لَيْسَ لَكَ بِهٖ عِلْمٌ
نہیں، اس کے بارے میں اِنِّیْ اَعِظُكَ اَنْ تَكُوْنَ مِنَ الْجَاهِلِيْنَ (۱۱/۴۶)
مجھ سے سوال نہ کر۔ میں تجھے نصیحت کرتا ہوں کہ جاہلوں میں نہ بن۔

یہ کوئی دلیل نہیں۔ اِس لیئے کہ حضرت نوح علیہ السّلام نے اُللہ تعالیٰ کے وعدہ میں کہ اُن کے اَہل وعیال کو نجات دیگا۔ تاویل کی۔ اَور ظاہری رشتہ کی بنا پر یہ سمجھا۔ کہ اُن کا بیٹا بھی "اَہل" میں شامل ہے۔ یہی سفارش کوئی اَور کرتا۔ تو اَجر کا مستحق ہوتا۔ حضرت نوح علیہ السّلام نے "غیر اہل" کی نجات کا سوال نہیں کیا۔ صِرف اِسی بنا پر ان کو جاہل بننے سے منع فرمایا گیا۔ نہ کہ گناہگار اور نافرمان ہونے سے۔ پھر حضرت نوحؑ اِس بنا پہ نادم ہوئے۔ اور باز آئے۔ لہٰذا اِس آیت میں معصیت کا ارادہ مطلقاً" ثابت نہیں ہوتا۔

حضرت ابراہیم علیہ السّلام

منکرین عصمت نے حضرت ابراہیم علیہ السّلام پر چند الزامات لگائے ہَیں۔ کہ آپ نے تین جھوٹ بولے۔ (۱) ستاروں میں دیکھ کر کہا۔ اِنّیْ سَقِیْم (۳۷/۸۹) مَیں تو بیمار ہوں۔ ۲۔ اپنی بیوی سارہ کو کہا۔ یہ میری بہن ہَے۔ (۳)، اَور بتوں کی شکست وریخت کے بَعد فرمایا بَل فَعَلَہٗ کَبِیْرُھُمْ ھٰذَا:۔ (۲۱/۶۳) بلکہ یہ ان کے بڑے بُت نے کیا ہوگا، (۴) آفتاب، مہتاب اور ستاروں کو" ھٰذَا رَبِّیْ" (۶/۷۶)، "یہ میرا رَب ہے" کہا۔ ۵۔ اِسی طرح جب مُردے زندہ کرنے کی درخواست کی۔ تو اَللہ تعالیٰ نے فرمایا"۔ کیا اِس پر ایمان نہیں؟ تو عرض کیا۔ کیوں نہیں۔ ایمان تو ہَے۔ لیکن محض اطمینانِ قلب چاہتا ہوں (۲/۲۶۰)

بحمد اللہ یہ سب الزامات ان کے وہم وگمان کے مطابق نہیں۔ بلکہ ہمارا ہی موقف اِن سے عیاں ہوتا ہے۔

اَقسامِ کذب

ابراہیم علیہ السّلام کے سہ گانہ کذب کے متعلق عرض ہے۔ کہ ہر کذب معصیت نہیں ہوتا۔ بلکہ بعض کذب، نیکی اور فرض، واجب ہوتے ہیں۔ جن کا تارک عاصی ہوتا ہے۔ اور رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم سے صحیح روایت ہے۔ کہ وہ شخص کاذب نہیں ہوگا۔ جو لوگوں میں صلح کی خاطر اچھی بات پہنچائے خواہ وہ اصل میں غلط ہو" دروغ مصلحت آمیز بہ از راستی فتنہ انگیز"،

اور نبی علیہ السّلام نے شوہر کو ایسی کذب بیانی کی اجازت دی۔ ہے۔ جو بیوی کو محبت حاصل کرنے میں مفید ہو۔ اور اسی طرح جنگ میں دروغ روا ہے ۔

اہل اسلام کا اجماع ہے۔ کہ اگر کسی شخص کو اطلاع ملی۔ کہ فلاں شخص پہ بادشاہ نے ظلم کیا ہے۔ اور اب اُس کو ناحق قتل کرنے اور اُس کا مال ضبط کرنے کی خاطر تلاش کر رہا ہے۔ اور مظلوم اُس کے پاس آکر چھپ گیا ہے۔ اور اِسے پناہ دہندہ نے ظالم کے لئے بددعا کرتے بھی سُنا ہے۔ اب بادشاہ نے پناہ دہندہ کو طلب کیا۔ اور اُس سے مفرور مظلوم کے متعلق دریافت کیا۔ تو اگر وہ صاف انکار کر دے۔ اور کہے مجھے معلوم نہیں۔ تو وہ عند اللہ ثواب کا مستحق اور اطاعت گذار ہوگا۔ اگر بادشاہ کو صاف صاف بتا دیا تو

وہ عنداللہ فاسق، عاصی، چغل خور وغیرہ کبائر کا مرتکب ٹھہرے گا۔ جان و مال کے تلف ہونے کے خطرہ سے بھی اظہارِ کفر میں کذب مباح ہے۔ ابراہیم علیہ السلام کے کذب بھی ممنوع اور ناروا کذب میں شامل نہیں۔ بلکہ قابلِ ستائش اور مصلحت آمیز ہیں "تفصیل ملاحظہ ہو"

حضرت سارہ کو بہن کہنا۔ آپ کا حضرت سارہ کو بہن کہنا۔ دو لحاظ سے درست ہے۔

۱۔ اللہ تعالیٰ نے فرمایا۔ اِنَّمَا الْمُؤْمِنُوْنَ اِخْوَۃٌ" (۴۹ - ۱۰) مومن آپس میں بھائی بھائی ہیں۔ نیز رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا کہ کوئی شخص اپنے بھائی کے پیغام پر پیغام نہ دے۔ یعنی رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے بھی سب مسلمانوں کو آپس میں بھائی بھائی قرار دیا ہے۔

۲۔ اِن کی ہم قوم اور رشتہ دار تھیں۔ نیز آپ کی امت میں شامل تھیں۔ اور نبی قوم کا بھائی ہوتا ہے۔ جیسے اللہ تعالیٰ نے ارشاد فرمایا ہے۔ وَاِلٰی مَدْیَنَ اَخَاھُمْ شُعَیْبًا" (۱۱ - ۸۴) اور مدین کی طرف اُن کے بھائی شعیب کو بھیجا۔

حضرت ابراہیم علیہ السلام کے اِس کلام کو وہی شخص کذب شمار کرے گا۔ جو معاذاللہ پہلے اللہ تعالیٰ کو کذب سے متہم کرے۔ جو کہ کفر صریح ہے۔ لہٰذا ثابت ہوا کہ ابراہیمؑ حضرت سارہ کو "اپنی بہن" کہنے میں حق بجانب اور راست گو تھے۔

ستاروں کی تاثیر۔

معترض کا یہ اعتراض کہ آپ نے ستاروں میں نگاہ ڈال کر " اِنّی سقیم " فرمایا یہ بھی جھوٹ نہیں۔ اِس لئے کہ ہم اِس بات کے قائل ہیں۔ کہ ستارے صحت ومرض اور دنیا کے بعض حوادث پر اثر انداز ہوتے ہیں۔ جیسا کہ بجلی کی چمک دریا کو جوش میں لاتی ہے۔ اور بادل کی گرج سے کھمبی بکثرت پیدا ہوتی ہے۔ اور چاند کے طلوع وغروب اور اُس کی کمی وبیشی کے تمام ادوار کو سمندر کے تدوجزر میں خاصا دخل ہے۔

ہاں قابل سرزنش وہ شخص ہے۔ جو اِن ستیاروں کو تدبیر خلق میں اللہ تعالیٰ کے ساتھ شریک کار اور بااختیار سمجھے۔ یا اللہ تعالےٰ کے بغیر تنہا ان کو موثر اور مدبر تسلیم کرے۔ یہ عقیدہ رکھنے والا واقعی کافر ہوگا۔

بَلْ فَعَلَهُ کَبِیْرُهُمْ هٰذَا

حضرت ابراہیم علیہ السلام کا قول " بلکہ یہ ان کے بڑے " بت " نے کیا ہوگا۔ اُن کی تصدیق وتائید کے لئے نہیں کہا تھا۔ کیونکہ کذب عبارت ہے بطور تحقیق خلاف واقعہ بات کہنے سے۔ یہ دراصل ان کو بطور زجر وتوبیخ فرمایا تھا۔ جسطرح اللہ تعالےٰ بطور توبیخ کسی جہنمی کو مخاطب فرمائے گا۔ " ذُق اِنّکَ اَنْتَ الْعَزِیْزُ الْکَرِیْم " (۴۴-۴۹) نوش فرمائیے! تم نہایت معزز ومکرم ہو۔ حالانکہ وہ رسوا وذلیل اور

عذاب میں مبتلا ہوگا۔ لہٰذا دونوں مقولے مخاطب کی سرزنش اور ملامت کی خاطر کہے گئے۔ کیونکہ ان کا اعتقاد تھا کہ بت ہی خیر و شر کے خالق ہیں۔ اور یہ دوزخی مذکور دُنیا میں بزعم خویش معزز و مکرم تھا۔

تلاش حق ؟

آفتاب و مہتاب کو دیکھ کر "ھٰذَا رَبِّی" یہ میرا رب ہے۔ کہنا "بعض مفسرین کا خیال ہے۔ کہ حضرت ابراہیم علیہ السّلام نے غار سے نکلتے ہی یہ فرمایا تھا۔ یہ قول محض بے بنیاد اور خود ساختہ ہے۔ کیونکہ ناممکن ہے۔ کہ کوئی شخص حدِّ تمیز کو پہنچتے ہی ایسا کلام کر سکے۔ حالانکہ اُس نے کبھی سُورج، چاند اور سُتاروں کو نہ دیکھا ہو۔ خود اللہ تعالیٰ نے اس غلط خیال اور تاویل کی قرآن میں تکذیب کی ہے۔

اور ہم نے ابراہیمؑ کو پہلے ہی سے وَلَقَدْ اٰتَیْنَا اِبْرَاھِیْمَ رُشْدَہٗ مِنْ قَبْلُ
ہدایت دی تھی ہم اُسے واقف تھے وَکُنَّا بِہٖ عَالِمِیْنَ ۔ (۲۱ - ۵۱)

محال ہے۔ کہ جسکو اللہ تعالیٰ نے شروع ہی سے رشد و ہدایت سے نوازا ہو۔ اُس کی "عقلِ سلیم" یہ بات باور کرے۔ کہ ستارے اس کے رب ہیں۔ یا سُورج اُس کا رب ہے۔ کیونکہ اُس کا جرم چاند سے بڑا ہے۔ یہ بات تو کسی دیوانے اور عقل کے اندھے کے سان و گمان میں ہی آسکتی ہے۔

حق تو یہ ہے۔ کہ یہ مقولہ بھی آپ نے خود زجر و توبیخ کے طور پر فرمایا تھا۔ جیسے کہ آپ نے "بَلْ فَعَلَہٗ کَبِیْرُھُمْ ھٰذَا" بطور تنبیہ و سرزنش کہا تھا۔

وہ لوگ صابی اور ستارہ پرست تھے۔ بتوں کو ستاروں کی شکل و صورت پر بنا کر ستاروں کا نام دیتے تھے۔ اور اُن کو اپنے معبدوں میں رکھتے۔ اور تھانوں میں سجاتے، اُن کی عیدیں مناتے۔ قربانیاں کرتے اور نذر و نیاز مانتے۔

اُن کا عقیدہ تھا۔ کہ بُت ذی عقل اور صاحب تدبیر ہیں۔ نفع و نقصان کے مالک ہیں۔ اور ہر ایک ستارے کی اُن کے ہاں الگ الگ شریعت مقرر تھی۔ حضرت ابراہیمؑ نے ان کو اسی عقیدہ کی بنا پر توبیخ و تنبیہ کی۔ اور اُن کی تعظیم کی تضحیک کرنے لگے۔

جیسا کہ اللہ تعالےٰ نے فرمایا ہے۔ فالیوم الذین اٰمنوا من الکفار یضحکون " (۸۳ - ۳۴) پس آج مومن کفار کی حالت پر ہنسیں گے

اِس طریق سے حضرت ابراہیمؑ نے اُن کے سامنے اجرام سماویہ کی عظمت و سطوت کا پول کھول دیا۔ اور ان کو واضح طور پر بتا دیا کہ وہ غلط راستے پر گامزن ہیں۔ اجرام سماویہ خود اثر پذیر اور زیر تدبیر ہیں۔ اور اِسی تدبیر و انتظام کے تحت مختلف مقامات میں تبدیل ہوتے رہتے ہیں۔

معاذ اللہ کہ حضرت ابراہیمؑ نے کبھی شرک کیا ہو یا کائنات کی کسی مخلوق کو خالق و کارساز قرار دیا ہو۔

اِس کلام کے زجر و توبیخ پر مبنی ہونے کی دلیل یہ ہے۔ کہ اللہ تعالیٰ نے حضرت ابراہیمؑ کو اس بات پر تنبیہ و عتاب نہیں کیا۔ بلکہ ان کی تصدیق و تائید کی ہے۔

یہ ہماری دلیل عقلی ہے۔ تِلْكَ حُجَّتُنَا آتَيْنَاهَا إِبْرَاهِيمَ عَلٰى قَوْمِهٖ جو ہم نے ابراہیمؑ کو اُن کی قوم کے مقابلے میں عطا کی تھی ۶۱ - ۸۴)

لہٰذا ثابت ہو گیا۔ کہ یہ تمام واقعات حضرت آدمؑ وغیرہ کے واقعات سے مختلف نہیں۔ اور رضاءِ الٰہی کے عین مطابق وقوع پذیر ہوئے ہیں۔

مُردے کو زندہ کرنا

آپ کا رَبِّ اَرِنِی کَیْفَ تُحْیِ الْمَوْتٰی کہا، اور اِس پر اللہ تعالیٰ نے جو فرمایا کہ اے ابراہیم تجھے یقین نہیں؟ کہا کیوں نہیں۔ یقین تو ہے۔ لیکن مزید اطمینانِ خاطر کیلئے سوال ہے۔

اِس آیت میں حضرت ابراہیمؑ کے ایمان و ایقان کو مشتبہ نہیں ٹھہرایا گیا۔ بلکہ ایمانی اور رُوحانی اعتبار سے ان کے علو مرتبت کا ثبوت مِلتا ہے۔ اگرچہ انہوں نے مُردہ، زندہ ہونے کی کیفیت ابھی ملاحظہ نہیں فرمائی۔ اور خود حضرت ابراہیمؑ کا بیان ہے۔ کہ وہ راسخ العقیدہ مؤمن ہیں۔ صرف کیفیتِ اِحیاء کا مشاہدہ مقصود تھا۔ مثلاً ہم ہاتھی، مگرمچھ، چاند گرہن، شاہِ وقت اور نادر روزگار عجوبہ چیز کے وجود میں شک اور انکار نہیں کرتے۔ پھر بھی اعجوبہ چیز جس نے کبھی نہ دیکھی ہو وہ اُسے دیکھنے کا متمنی اور خواہشمند ضرور ہوتا ہے۔ اور اِس کے دل میں عجیب چیز دیکھنے کی حسرت ہوتی ہے۔ حالانکہ اُس کے دل میں اُس چیز کے وجود کے بارے میں کوئی شک وشبہ نہیں ہوتا۔

بنی علیہ السّلام نے فرمایا ۔ نحن احق بالشک من ابراھیم کہ ہم ابراہیم علیہ السّلام کی نسبت شک کرنے کے زیادہ مستحق ہیں ۔

دریں حالت جو شخص یہ سمجھے کہ نبی علیہ السّلام کو اللہ کی صفت احیاء میں شک تھا وہ صریحًا کافر ہے ۔ دراصل یہی حدیث حضرت ابراہیم علیہ السّلام سے "عدم شک" کی دلیل ہے ۔

حدیث کا پس منظر

واقعہ یہ ہے ۔ کہ جب آیت" رَبِّ اَرِنِی کَیْفَ تُحْیِ الْمَوْتٰی الخ" ، نازل ہوئی ۔ تو بعض لوگ کہنے لگے ۔ دیکھو! حضرت ابراہیمؑ کے دل میں اللہ تعالیٰ کی قدرت کے بارہ میں شک واقع ہوا ہے ۔ اور ہمارے نبی علیہ السّلام کو ذرا شک نہیں ۔ تو ہمارے نبی کا درجہ ابراہیمؑ سے فائق ہے ۔ اُس وقت آنحضرتؐ نے ازراہ تواضع یہ حدیث بیان فرمائی (مترجم)

یعنی اگر حضرت ابراہیمؑ کا یہ سوال بطور شک ہوتا ۔ تو وہ لوگ حضرت ابراہیمؑ سے شک کے زیادہ سزاوار تھے ۔ جنہوں نے اللہ تعالیٰ کی صفتِ احیاء کا مشاہدہ نہیں کیا ۔ جس کا حضرت ابراہیمؑ کو ہو چکا ہے ۔ جب ایسے لوگ جنہوں نے قدرتِ احیاء کا بالکل مشاہدہ نہیں کیا ۔ شک نہیں کرتے ۔ تو حضرت ابراہیمؑ کا بالاولیٰ شک سے بالاتر ہوئے ۔

حاصلِ کلام

اس آیت کی بنا پر جو شخص حضرت ابراہیمؑ کیطرف شک وشبہ منسوب کرتا ہے ۔ وہ دراصل ان کیطرف کفر منسوب کرتا ہے ۔ اور جو شخص نبی کو کافر کہتا ہے ۔ بلاریب وہ خود

بفرضِ محال یہ سوال اگر اِن سے بطور شک صادر ہوتا ہے۔ تو قدرتِ خداوندی پر ہم اُن سے بدرجہا زیادہ شک وشبہ کا شکار ہوتے ہیں۔ جب ہم شک وارتیاب میں مبتلا نہیں۔ تو ابراہیمؑ اِس سے بالاو مبرا ہونگے بحمد اللہ! ہم اِس اعتقاد کی بیہودگی سے خوب واقف ہیں اور تسلیم کرتے ہیں۔ کہ کائنات کی کوئی چیز اللہ تعالیٰ کی قدرت و دسترس سے بالا نہیں۔

کافر کیلئے اِستغفار

منکرین عصمت نے "سَاَسْتَغْفِرُ لَکَ رَبِّی (۱۹ - ۴۷) میں اپنے رب سے تیرے لیئے اِستغفار کرونگا سے بھی استدلال کیا ہے۔ یہ کوئی قابلِ حجت بات نہیں۔ کیونکہ آپ کو استغفار سے منع نہیں کیا گیا تھا۔ فَلَمَّا تَبَیَّنَ لَہٗ اَنَّہٗ عَدُوٌّ لِّلّٰہِ تَبَرَّاَ مِنْہُ (۹ - ۱۱۴) اور جب یہ واضح ہو گیا۔ کہ" والد خدا کا دشمن ہے تو اِس سے بیزاری کا اظہار کیا جس پر اللہ تعالیٰ نے اُن کی مدح و توصیف فرمائی۔

معلوم ہوا کہ حضرت ابراہیم علیہ السلام کا اپنے والد کیلئے استغفار کرنا، اُن کی زندگی میں ایمان لانے کی اُمید پر منحصر تھا۔ جب وہ بحالت کُفر فوت ہو گیا۔ تو آپ نے بیزاری کا اظہار کیا۔ اور پھر کبھی استغفار نہیں کیا

حضرت لُوط علیہ السلام

منکرین عصمت نے لُوط علیہ السلام پر اِس آیت سے اِلزام عائد کیا

ہے۔ لَوْ اَنَّ لِیْ بِکُمْ قُوَّۃً اَوْ اٰوِیْ اِلٰی رُکْنٍ شَدِیْدٍ (۱۱-۸۰) اے کاش "آج" مجھ کو تمہارے مقابلہ کی طاقت ہوتی۔ یا میں کسی زبردست سہارے کا آسرا پکڑ جاتا۔" اور ایک حدیث بیان کی ہے۔ رَحِمَ اللّٰہُ لُوْطًا لَقَدْ کَانَ یَاوِیْ اِلٰی رُکْنٍ شَدِیْدٍ، اللہ تعالیٰ لوط علیہ السلام پر رحم کرے وہ طاقت ور حمایتی کی پناہ طلب کیا کرتے تھے۔

اُن کے خیال میں نبی علیہ السلام کا یہ ارشاد گرامی حضرت لوطؑ پر اعتراض کا حکم رکھتا ہے۔ اور آپ نے اِن کے طرزِ عمل پر تنقید فرمائی ہے۔ دیگر آپ نے کافروں سے کہا۔ هٰٓؤُلَآءِ بَنَاتِیْ هُنَّ اَطْهَرُ لَكُمْ (۱۱-۷۸) یہ جو میری لڑکیاں ہیں۔ تمہارے لئے جائز اور پاک ہیں۔ یہ دلائل بھی باطل ہیں۔ اِس لئے مذکورہ بالا آیت میں "اِلٰی رُکْنٍ شَدِیْدٍ" اور حدیث میں باہمی کوئی تضاد نہیں۔ بلکہ دونوں آیت اور حدیث مترادف اور ہم معنی ہیں۔ کیونکہ لوط علیہ السلام کسی فوری قوت اور ہنگامی مدد کے طالب تھے۔ جو خویش اقربا، قوم اور اُمت سے حاصل ہو جس سے اپنی غلط کار قوم کی غلط خواہشات پر قدغن لگا سکیں۔ آپ غافل نہ تھے کہ اللہ تعالیٰ کی مضبوط طاقت اور زبردست سہارے کا آسرا پکڑ سکتے ہیں۔

ان پر لوگوں کا تعاون حاصل کرنے میں کوئی گناہ نہیں آیا۔ اللہ تعالیٰ نے فرمایا ہے لَوْلَا دَفْعُ اللّٰهِ النَّاسَ بَعْضَهُمْ بِبَعْضٍ لَّفَسَدَتِ الْاَرْضُ (۲/۲۵۱) اگر اللہ تعالیٰ لوگوں ہی سے لوگوں کا دفاع نہ کرتا تو زمین پر ہمیشہ فساد برپا رہتا۔

اسی مقصد کے تحت حضرت لوط علیہ السلام نے لوگوں سے تعاون حاصل کرنے کی آرزو کی تھی ۔ خود نبی علیہ السلام نے تبلیغ رسالت میں انصار اور مہاجرین کی مدد حاصل کی ۔ پھر حضرت لوط علیہ السلام کے انسانی تعاون حاصل کرنے میں کسی کو کیا اعتراض اور نکتہ چینی کی گنجائش ہے ؟

نبی علیہ السلام نے لوط علیہ السلام پر نکتہ چینی نہیں کی ۔ بلکہ صرف یہ بتایا ہے ۔ کہ لوط علیہ السلام "رکن شدید" زبردست سہارا ، کی پناہ لیتے تھے ۔ اور "رکن شدید" دراصل خدائی مدد بذریعہ ملائکہ تھی ۔ جس کا لوط ؑ کو علم نہ تھا ۔

اور جس یہ اعتقاد ہو ۔ کہ لوط علیہ السلام کا عقیدہ تھا ۔ کہ ان کے لیئے اللہ تعالیٰ کی جانب سے کوئی پناہ اور سہارا نہیں ۔ وہ کافر ہے ۔ کیونکہ اس نے ایک نبی کو کفر کی جانب منسوب کیا ۔

نیز اللہ تعالیٰ سے عدم تحفظ کا خیال ایک بدترین ظن ہے ۔ یہ محال ہے ۔ کہ جس کو اللہ تعالیٰ نے معجزات سے نوازا اور وہ شب و روز اس کی طرف دعوت میں مصروف ہو ، وہ ایسا فرسودہ خیال کرے ۔

دختران لوط علیہ السلام

حضرت لوط علیہ السلام کا کہنا کہ "یہ میری بیٹیاں ہیں" اس سے ان کا مطلب نکاح اور محل مباح میں جماع تھا ۔ ہمارا ادعیٰ ثابت ہوگیا ۔ کیونکہ یہ ناممکن ہے کہ جو شخص ایک بدکاری سے روکے اور کسی دوسری بدکاری کی دعوت دے ۔

برادران یوسف علیہ السلام

منکرین عصمت نے برادران یوسف علیہ السلام کے متعلق فریب دہی، یوسفؑ کو فروخت کرنے، اور اپنے والد ماجد سے دروغگوئی کے الزامات عائد کئے ہیں یہ دلائل بے وزن اور بے بنیاد ہیں۔ کہ ان کے متعلق کوئی نص کتاب وسنت میں موجود نہیں ہے نہ اجماع نہ قول صحابہ، ہاں یوسفؑ کی نبوت کی قرآن پاک میں تصریح موجود ہے۔

قبل ازیں تمہارے پاس یوسفؑ لَقَدْ جَاءَكُمْ يُوسُفُ مِنْ قَبْلُ
معجزات لیکر آئے تم ان کے فرمودات بِالْبَيِّنَاتِ فَمَا زِلْتُمْ فِي شَكٍّ مِمَّا
میں برابر شک کرتے رہے یہاں جَاءَكُمْ بِهِ حَتَّىٰ إِذَا هَلَكَ قُلْتُمْ
تک کہ وہ اللہ کو پیارے ہوگئے تو لَنْ يَبْعَثَ اللَّهُ مِنْ بَعْدِهِ رَسُولًا (۳۴
تم نے کہا۔ اللہ تعالیٰ ان کے بعد ہرگز کوئی رسول نہ بھیجے گا۔

برادران یوسف علیہ السلام کے کارنامے شاہد ہیں کہ وہ کبائر سے اجتناب نہیں کرتے تھے۔ وہ انبیاء کی فہرست میں کیونکر شامل ہوسکتے ہیں۔ ہاں یوسفؑ اور یعقوبؑ دونوں نے ان کے لیے دعائے بخشش ضرور کی تھی۔ اور کوئی سرزنش نہیں فرمائی۔

برادران یوسف علیہ السلام کے عدم نبوت کے دعویٰ کی دلیل حضرت یوسف علیہ السلام کا وہ مقولہ ہے۔ جو اللہ پاک نے قرآن مجید میں بیان فرمایا ہے۔ "أَنْتُمْ شَرٌّ مَّكَانًا" (۱۲ - ۷۷) تم بدترین لوگ ہو۔ ایسے الفاظ کسی نبی بلکہ صالح فرد کے لیے بھی استعمال نہیں ہو

سکتے۔ کہ وہ بدترین درجہ کے لوگ نہیں ہوتے۔ اور انبیاء کی تعظیم و تکریم سب پر فرض واجب ہے۔

ابن نوحؑ اور برادران یوسفؑ

نوح علیہ السلام کا بیٹا، برادران یوسفؑ کی نسبت اپنے باپ کا زیادہ باغی اور نافرمان تھا۔ اور برادران یوسفؑ نافرمان تو تھے مگر کافر نہ تھے۔

غیر نبی کو انبیاء کی جماعت اور فہرست میں شامل کرنا اور ایسے نبی تسلیم کرنا کسی مسلمان کے شایانِ شان نہیں۔ مصنوعی نبی کی تصدیق اور سچے نبی کی تکذیب میں کوئی تفاوت نہیں۔ دونوں کا گناہ یکساں ہے۔

نبی کی اولاد نبی ہوتی ہے؟

اگر برادران یوسفؑ کی نبوت کی تصدیق کرنیوالے زید بن ارقم کی یہ روایت پیش کریں کہ ابراہیم بن رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کی وفات محض اس لئے ہوئی کہ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کے بعد کوئی نبی نہ تھا۔ اور نبیوں کی اولاد بھی نبی ہوتی ہے۔ اِنما مات ابراھیم بن رسولِ اللہ صلعم لانّہ لا نبی بعد رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم واولاد الانبیاء، انبیاء"

تو یہ ایک عالم کی لغزش، نادانی اور بوجوہ شدید خود فریبی ہے۔

۱ - یہ ایک دعویٰ بلا دلیل ہے۔ (۲) اگر یہ اصول درست ہے
تو ممکن ہے حضرت عیسیٰؑ اور یحییٰؑ کیطرح (معاذ اللہ) ابراہیم بھی گہوارے
میں ہی نبی ہوں۔ اور ۲۲ ماہ کی عمر پاکر رحلت فرما گئے۔ ہم ایسے
عقیدے سے اللہ کی پناہ مانگتے ہیں۔

۳ - حضرت نوح علیہ السلام کا بیٹا بروئے نص قرآنی کافر اور
غیر صالح تھا۔ اگر نبیوں کی اولاد لازماً نبی ہوتی تو یہ کافر اور معتوب
بارگاہِ ایزدی بھی ضرور نبی ہوتا۔ (معاذ اللہ)

۴ - اگر ایسا ہوتا تو لازماً تمام یہود نبی ہوتے۔ بلکہ تمام روئے
زمین کے باشندے نبی ہوتے کیونکہ حضرت آدم علیہ السلام
کے سب اولاد ہیں۔ اور حضرت آدم علیہ السلام نبی تھے۔ پھر اولاد
کی اولاد نبی ہو۔ اس لئے کہ اُن کے آبا نبی تھے۔ اسی طرح یہ
سلسلہ ہم تک پہنچ جائے۔ اس عقیدے کی بے ہودگی اور کفر
بالکل عیاں ہو چکا ہے۔ و باللہ التوفیق

شاید کوئی کوتاہ علم اعتراض کرے کہ یہ برادران یوسفؑ
کی نبوت کا تو منکر ہے۔ اور مجوس کے بنی اُم اسحاق، ام موسیٰ اور
مریم علیہن السلام کی نبوت کا قائل ہے۔ ہم بفضل خدا اپنے دلائل پیش
کرتے ہیں۔ تاکہ حقیقت بے نقاب ہو جائے۔ اور اسی کا سہارا
پکڑتے ہیں۔

جس کی نبوت کی اطلاع اللہ نے ہمیں نہ دی ہو۔ رسول اللہ صلعم نے

اس کی نبوت کی تصریح نہ فرمائی ہو۔ اور جمہور نے بتواتر اس کے معجزات نقل نہ کیئے ہوں۔ ہم اس کے نبی ہونے کا اقرار نہیں کرتے۔ بلکہ اس کی تردید کرتے ہیں۔ اس لیئے کہ جھوٹے نبی کا اعتراف و اذعان اللہ تعالیٰ پر افتراء و بہتان ہے۔ جو ایک مسلمان سے محال ہے۔

اُمہات انبیاء کی نبوت

اور جس نبی کی صراحت قرآن میں مذکور ہو ہم اس کی تردید نہیں کرسکتے۔ چنانچہ موسیٰؑ، عیسیٰؑ، اسحاقؑ علیہم السلام کی ماؤں کے متعلق قرآن پاک میں بوضاحت مذکور ہے۔ کہ بعض سے ملائکہ ہم کلام ہوئے۔ اور بعض کو اللہ تعالےٰ نے غیبی امور کی اطلاع بخشی۔ اور یہی نبوت ہوتی ہے۔ اس کے علاوہ نبوت کسی چیز کا نام نہیں۔ لہٰذا بنص قرآن ان کی نبوت ثابت ہوگئی؟

نبیٔ مجوس

مجوس کا اہل کتاب ہونا یقینی امر ہے کہ نبی علیہ السلام نے ان سے جزیہ وصول فرمایا تھا۔ جو بجز اہل کتاب کے لینا مباح نہیں۔ پس جو شخص نبی علیہ السلام کی طرف ”غیر اہل کتاب سے جزیہ وصول کرنے کی نسبت کرے۔ اس نے آپؐ پر اللہ تعالیٰ کی نافرمانی کا افتراء کیا۔ اور ایسے گناہ کی جرأت کی جس سے مسلمانوں کے رونگٹے کھڑے ہوجاتے ہیں۔ ہم پورے یقین کے ساتھ کہہ سکتے ہیں۔ کہ وہ اہل کتاب ہیں۔ کیونکہ بغیر نبی کے ... جس کے سپرد تعلیم تبلیغ ہوتی ہے ... کتاب کا نازل کرنا محال اور خلاف دستور الٰہی ہے۔

لہٰذا واضح ہو گیا۔ کہ مجوس میں بھی یقیناً کوئی نہ کوئی نبی بھیجا گیا تھا۔ مزید برآں لاتعداد لوگوں نے اِس سے معجزاتِ انبیاء نقل کئے ہیں۔ اور جو بات باہمی اتفاق اور سمجھوتے کے بغیر جمہور اور انبوہِ عظیم نقل کریں۔ اِس کا تسلیم کرنا واجب ہوتا ہے۔

وہ متواتر روایات جن کا مشاہدہ سے تعلق ہے۔ اُن کے بیان میں مسلم اور غیر مسلم کا کوئی امتیاز نہیں۔ جو شخص صرف اہل اسلام کی متواتر روایات کے قبول کرنے کے قائل ہیں۔ ہم اُس سے یہ دریافت کریں گے۔ کہ شاہان رُوم کی موت کی خبر، آپ کے نزدیک کیسے درجہ صحت کو پہنچ سکتی ہے۔ حالانکہ اُن کے پاس کوئی مسلم موجود نہ تھا۔ یہ خبر ہمیں صرف یہود نے، عیسائیوں سے نقل کر کے بتائی ہے۔ ایسے اور بیسیوں واقعات موجود ہیں۔ جو اُن کی تردید کرے گا۔ وہ حواس باختہ ہے اور خود فریبی میں مبتلا ہے۔ اور ہمیں معلوم ہے۔ کہ اہل اسلام غیر مسلم جمہور کی روایات کو اُن کے مسائل کی صحت کی حد تک درست سمجھتے ہیں۔ مزید برآں مسلمانوں کا ہدایت یافتہ ہونا بھی جمہور کی خبر متواتر سے معلوم ہے۔

الغرض جمہور کی نقل روایت کی صحت و درستی، اسلامی اصولوں کی مرہونِ منت نہیں۔ بلکہ یہ تو بدیہی امر ہے۔ اللہ تعالیٰ نے بتایا ہے۔ کہ پہلے لوگوں کی کتابیں اور نوشتے ہیں۔ "وَرُسُلًا قَدْ قَصَصْنَاهُمْ عَلَيْكَ مِنْ قَبْلُ وَرُسُلًا لَّمْ نَقْصُصْهُمْ عَلَيْكَ"[۴۴] ہم نے بعض رسولوں کے حالات آپکو بتائے اور بعض کے نہیں بتائے۔

حضرت یوسف علیہ السلام

منکرین عصمت کہتے ہیں کہ (۱) یوسُف علیہ السلام کا اپنے بھائی بنیامین کو گرفتار کرنا ، اور (۲) والد کو پریشان کرنا ۔ خلاف عصمت ہے۔ وہ عرصہ دراز تک ان کی جدائی میں تڑپتے رہے ۔ درانحالیکہ وہ اپنے والد کو حقیقت حال سے آگاہ کر سکتے تھے ۔ اور حضرت یوسف کو اُن کے شدید صدمہ کا علم تھا ۔ صِرف ان کے درمیان دس دِن کا سفر حائل تھا ۔ بایں ہمہ ایسا نہیں کیا ۔

۳ ۔ شاہی پیمانہ بھائی کے سامان میں چُپکے سے رکھوا دیا ۔ پھر خود ہی منادی کرادی ۔ کہ قافلہ والو! تم چور ہو ۔ حالانکہ وہ چور نہ تھے ۔

۴ ۔ وَلَقَدْ هَمَّتْ بِهٖ وَهَمَّ بِهَا لَوْلَاۤ اَنْ رَّاٰ بُرْهَانَ رَبِّهٖ (۱۲ ۔ ۲۴) زلیخا ارادہ کر چکی تھی ۔ اور اُس نے بھی ارادہ کر لیا ہوتا ۔ اگر وہ "بُرہان ربّانی" نہ دیکھتے

۵ ۔ فرعون کی ملازمت و خدمت کی ۔

۶ ۔ اپنے رفیق جیل سے کہا ۔ اُذْكُرْنِىْ عِنْدَ رَبِّكَ (۱۲ ۔ ۴۲) اپنے مالک سے میرے بارے میں بھی کہنا ۔

یہ تمام شکوک و اعتراضات خرافات ہیں ہم بفضل خدا ہر ایک کی قلعی کھولتے ہیں ۔

بھائی کی گرفتاری

بھائی کی گرفتاری جس سے والد کی پریشانی کی نوبت آئی اور صرف اِس لئے تھی ۔ کہ اِس کے ساتھ محبت و شفقت کا اظہار کریں اور باقیماندہ بھائی بھی دوبارہ واپس چلے آئیں ۔ اور یہ گرفتاری دائمی

رفاقت کا باعث ہو۔ اگر وہ بن یامین کو اپنے ساتھ لے جاتے تو غالباً وہ کبھی واپس نہ آتے۔ کیونکہ وہ دوسری حکومت کے باشندے تھے جہاں حضرت یوسف اور عزیز مصر کا کوئی عمل دخل نہ تھا۔ وہ رسول جسے اللہ تعالیٰ علم و عرفان اور تعبیر رؤیاء سے نوازے اس کے افعال کردار کی احسن ترین توجیہہ کے علاوہ کسی اور امر کی قطعاً گنجائش نہیں نیز منکرین عصمت کے پاس ہمارے مذکورہ دلائل کے خلاف کوئی نص موجود نہیں۔

ایک صالح مسلمان کے متعلق والدین کی نافرمانی اور عصیان کا گمان درست نہیں۔ چہ جائیکہ ایک برگزیدہ رسول پر بدگمانی کی جائے۔

والد کو اطلاع نہ دینا۔ یہ اعتراض کہ یوسف علیہ السلام عرصۂ دراز تک تک گم اور مفقود الخبر رہے۔ اور دانستہ والد کو حرمان نصیب رکھا۔ اور کوئی خبر خیریت نہ دی ———— دراصل یہ اعتراض غایت درجہ غفلت اور جہالت پر مبنی ہے۔ کیونکہ حضرت یعقوب علیہ السلام فلسطین کے علاقہ کنعان میں ایک فاقہ کش اور خانہ بدوش قوم کے درمیان رہائش پذیر تھے۔ جہاں کی زبان الگ، حکومت علیحدہ اور قوم دیگر تھی۔ جیسے آج کل ہمارے مضافات میں وہ لوگ ہیں جو عیسائی مقبوضات فالیش وغیرہ میں آباد ہیں یا صحرا بریں سکونت پذیر ہیں۔ دیگر حضرت یوسف علیہ السلام کو جدائی کے بعد والد ماجد کے متعلق کوئی خبر نہ تھی۔ زندہ ہیں یا نہیں۔ زیادہ سے زیادہ اُن

کو صرف اللہ تعالیٰ کے وعدہ کا خیال ضرور تھا۔ کہ وہ بھائیوں کو ان کے کرتوت سے آگاہ ضرور کریں گے۔

نیز اُن کو مذکورہ بالا" علاقائی اختلاف کے باعث کوئی معتبر اور قابل اعتماد آدمی نہ مِل سکا۔ جسے اُن کیطرف رَوانہ کرتے

بنائے اعتراض

مصر و شام کے درمیان آمد و رفت وہی شخص آسان سمجھتا ہے۔ جو آج کل کی صورت حال پر قیاس کرتا ہے۔ کہ دونوں ممالک میں ایک امیر، ایک مذہب۔ ایک زبان اور ایک ہی قوم آباد ہے۔ رستہ رَاہرو ہے۔ تاجروں کی آمد و رفت ہے۔ رَاستے میں مسافر آتے جاتے ملتے ہیں۔ رَسل و رَسائل کا سلسلہ قائم ہے لیکن اُس زمانے کے حالات دگرگوں تھے . . . . مندرجہ بالا حقائق کی دلیل یہ ہے۔ کہ جب حضرت یوسف علیہ السلام نے حالات پر قابو پالیا۔ تو ذرا برابر تاخیر سے کام نہیں لیا۔ فورًا وَالدین اور جملہ اَہل و عیال کو بلوالیا۔ جبکہ عام قحط اَور خشک سالی کے باعث لوگ ان کے محتاج اور تابع فرمان تھے۔

نیز جب بھائیوں نے کنوئیں میں پھینک دیا تھا۔ تو اسی وقت اللہ تعالیٰ نے وعدہ فرمایا تھا۔ آپ اِس" وعدہ رَبّانی" کی تکمیل کے منتظر تھے۔ لہٰذا وہ اطلاع پاتے ہی حسب وَعدہ خداوندی بصد شوق و نیاز چلے آئے۔

ہم نے لبنان کس اور آفریج کے اکثر اُمرا کو دیکھا ہے اگر انہیں

والدین کو اپنے پاس بلوانا ممکن ہوتا تو وہ فوراً بلوا لیتے ۔ مگر وہ ایسی مشکلات میں پھنسے کہ نہ بلوا سکے ۔ اور یہی حالات حضرت یوسف علیہ السّلام کو درپیش تھے ۔

سَرِقَہ

بھائیوں کو چور کہنا ، حالانکہ وہ چور نہ تھے ۔ بلکہ خود حضرت یوسف علیہ السّلام نے پیمانہ اس کے سامان میں رکھوا دیا تھا ۔ تو حقیقت یہ ہے ۔ کہ یوسف ؑ نے بالکل صحیح فرمایا تھا ۔ اس لئے کہ انہوں نے حضرت یوسف کو والد سے چرا کر فروخت کر دیا تھا ۔ حضرت یوسف علیہ السلام نے " سَرَقتُم الصَّوَاع " تم نے پیمانہ چرایا ہے " ہرگز نہیں کہا ۔ بلکہ صرف یہی کہا ہے ۔ کہ شاہی پیمانہ نہیں ملتا ۔ اور وہ اس اعلان میں بالکل حق بجانب اور راست گو تھے ۔ کیونکہ اُن کے پاس وہ موجود نہ تھا ۔ لہٰذا وہ اس کو مفقود پا رہے تھے ۔

غیر مسلم حکومت کی ملازمت

فرعون کی ملازمت محض " خطرہ " کے باعث اختیار کی ۔ کہ اس حسنِ تدبیر سے ممکن ہے ۔ اللہ تعالیٰ اِن کی گلو خلاصی کرا دے ۔ اور یہ بھی عین ممکن ہے ۔ کہ عزیز مصر یا بعض ارکان سلطنت حضرت یوسف ؑ پر ایمان لے آئے ہوں ۔

آپ کی یہ خدمت اور ملازمت بہرکیف نیکی اور کار خیر تھی والد بزرگوار کی ملاقات عدل و انصاف کے قیام اور لوگوں کی زندگی کی

حفاظت کا ذریعہ تھی ۔ مزید برآں انہیں غلبہ حاصل کرنے کی قوت نہ تھی ۔ اور اس کے بغیر کوئی اور ذریعہ ممکن نہ تھا ۔ نیز ان کی شریعت میں یہ امر مباح اور جائز تھا ۔ اللہ تعالےٰ نے فرمایا ہے ۔ وَلِكُلٍّ جَعَلْنَا مِنْكُمْ شِرْعَةً وَّمِنْهَاجًا (۵ ۔ ۴۸) ہم نے ہر ایک فرقہ کے لئے ایک دستور اور طریقہ مقرر کیا ہے ۔

سجدہ

والدین کا انہیں سجدہ کرنا ، حضرت یعقوب ؑ اور یوسف علیہما السلام کی شریعت میں ناجائز نہ تھا ۔ بلکہ ایک کارِ خیر اور ان کے خواب من جانب اللہ کی تعبیر تھی یہ سجدہ بطور تحیۃ وسلام تھا ۔ جیسا کہ ملائکہ حضرت آد کے سامنے سجدہ ریز ہوئے تھے ۔ سجدۂ عبادت و تذلل قطعاً نہ تھا محض تعظیمی سجدہ تھا ۔

غیر اللہ سے توصّل

اپنے رفیق جیل سے کہنا کہ" اپنے مالک سے میرے بارے میں بھی کہنا" یہ کوئی قابل اعتراض بات نہیں ۔ اس لئے کہ قید سے رہائی کی آرزو کوئی ممنوع امر نہیں ۔ اور نہ ہی اس امر سے اللہ تعالیٰ سے بے نیازی اور غفلت کا پہلو نکلتا ہے ۔ البتہ انہوں نے رفیق جیل کو ایک نیک کام کی ترغیب دی ۔ اور اس پر آمادہ کیا ۔ جو بوجوہ آپ کے لئے ضروری تھا ۔ اپنی ذات کو ظلم وستم سے بچانے کیلئے اور ایسے نیک کام کی تلقین کے لئے ۔

نسیان

فَاَنسٰهُ الشَّیطٰنُ ذِکرَ رَبِّهٖ (۱۲-۴۲) شیطان نے اُسے اپنے مالک کے پاس ذکر کرنے سے بھلا دیا۔ "فانساہ" میں ضمیر منصوب "ہ" حضرت یوسفؑ کے "رفیق جیل" کی طرف راجع ہے۔ یعنی شیطان نے اُسے حضرت یوسفؑ کا معاملہ پیش کرنے سے فراموش کر دیا۔

اِس امر کی دلیل "وَادَّکَرَ بَعدَ اُمَّۃٍ" ہے۔ اُسے مدت کے بعد وہ بات یاد آئی۔ (۱۲-۴۵) یعنی عرصہ بعد یاد آنے کی بات وہی ہے۔ جو وہ اپنے مالک کے پاس "شیطانی بھول" کے باعث پیش کرنا بھول گیا تھا۔ تاوقتیکہ اُسے وہ بات یاد آگئی۔ ۔ ۔ ۔ ممکن ہے آیت میں "ذِکرَ رَبِّهٖ" سے مراد اللہ تعالیٰ کا ذکر ہو۔ کہ اگر وہ اللہ تعالیٰ کو یاد کرتا۔ تو حضرت یوسفؑ کی ضرورت کو بھی ضرور یاد کرتا۔

اگر "فَاَنسٰهُ" کی ضمیر منصوب حضرت یوسفؑ کی طرف بھی راجع ہو تو۔ اِس میں کوئی قباحت اور محظور لازم نہیں آتا۔ اِس لئے انبیاء علیہم السلام سے "سہواً" "خلاف شرع" افعال سرزد ہو سکتے ہیں۔

ھَمّ کا مفہوم

وَلَقَد ھَمَّت بِهٖ وَھَمَّ بِھَا لَولَا اَن رَّاٰ بُرھَانَ رَبِّهٖ (۱۲-۲۴) زلیخا ارادہ کر چکی تھی۔ اور اُس نے بھی ارادہ کر لیا ہوتا۔ اگر وہ "برہان ربانی" نہ دیکھتے۔ بعض کوتاہ اندیش لوگ تو یہاں تک بھی کہہ چکے ہیں۔ کہ وہ وہاں پر بیٹھ گئے تھے۔ جہاں مرد کی عورت

سے "بوقت جماع" نشست ہوتی ہے۔

ایک ظاہر بین اور سطحی نظر رکھنے والے نے اس آیت سے یہ مفہوم لیا ہے۔ معاذ اللہ کیونکہ یہ تو ایک ادنیٰ نیک مسلمان سے بھی مناسب معلوم نہیں ہوتا۔ چہ جائیکہ ایک برگزیدہ نبی کے متعلق یہ بدگمانی کی جائے۔

تحقیق قول ابن عباسؓ

معترض کہے کہ یہ تو حضرت ابن عباسؓ سے بسند صحیح منقول ہے، تو گزارش ہے۔ کہ بجز قول رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم" کسی کا قول حجت نہیں۔ دیگر ابن عباسؓ کے قول میں غلطی دراصل ابن عباسؓ کے علاوہ نیچے کے کسی راوی سے لاحق ہوئی ہے۔ اور ممکن ہے۔ کہ ابن عباسؓ نے بھی اس روایت پر یقین نہ کیا ہو۔ اور کسی مجہول شخص سے سن کر بیان کر دیا ہو۔ اس لیئے کہ آپ" اُس وقت" موقعہ پر موجود نہ تھے۔ اور نہ ہی ابن عباسؓ نے رسول اللہ صلعم سے یہ قول روایت کیا ہے۔ اور یہ ناممکن ہے۔ کہ ابن عباسؓ "نامعلوم" واقعہ پر قطعی رائے دیں۔

آیت کا مفہوم

درج ذیل دو معانی میں سے آیت کا ایک معنی یہ ہے۔ (۱) مار گرانے اور زد و کوب کا ارادہ تھا جیسا کہ "هَمَّتْ كُلُّ اُمَّةٍ بِرَسُوْلِهَا لِيَاْخُذُوْهُ" (۴۰-۵) کہ ہر اُمت نے اپنے رسول کے بارے میں

بھی ارادہ کیا۔ کہ پکڑ لیویں اُس کو۔ اور محاورہ ہے " هَمَمْتُ بِكَ " کہ میں نے تمہارے متعلق ارادہ کیا تھا۔ لیکن اللہ تعالےٰ نے آپ کو "برہان" دکھا دی۔ جس کے باعث آپ اس کے زد وکوب سے بے نیاز ہو گئے۔ اور آپ کو معلوم ہو گیا۔ کہ یہاں سے بھاگ جانا، زیادہ مفید ہے۔ کہ عفت و پاکدامنی کا واضح ثبوت ہے۔ جیسا کہ بعد میں قمیص پھٹنے کے واقعہ سے" شاہد کے فیصلہ سے ظاہر ہوا۔ ۲- آیت " وَلَقَدْ هَمَّتْ بِهٖ" تک تام اور مکمل ہو جائے۔ اور دوسرا واقعہ " وَهَمَّ بِهَا لَوْلَآ اَنْ رَّاٰ بُرْهَانَ رَبِّهٖ " سے شروع ہو۔ یعنی اگر یوسفؑ " برہان ربانی" نہ دیکھتے تو وہ بھی اس سے ارادہ کر لیتے۔ آیت کے ظاہری معنی بغیر کسی تاویل کے تکلف کے یہی ہیں۔ اور یہی ہمارا مسلک ہے۔

ایک روایت

حضرت انس بن مالکؓ سے روایت ہے۔ کہ نبی علیہ السلام نے آیت " ذٰلِكَ لِيَعْلَمَ اَنِّيْ لَمْ اَخُنْهُ بِالْغَيْبِ " (۱۲- ۵۲) یہ اس لئے کہ اُسے معلوم ہو جائے۔ میں نے اُس کی عدم موجودگی میں خیانت نہیں کی تلاوت فرمائی۔ تو بیان کیا۔ کہ جب حضرت یوسف علیہ السلام نے یہ کہا تو حضرت جبریلؑ نے اعتراض کیا۔ کہ اپنے " هَمّ " قصد و ارادہ کو یاد کرو۔ تو حضرت نے جواب دیا۔ وَمَآ اُبَرِّئُ نَفْسِيْ اِنَّ النَّفْسَ لَاَمَّارَةٌ بِالسُّوْٓءِ (۱۲- ۵۳) میں اپنے نفس کی براءت نہیں کرتا۔ کیونکہ نفس تو برائی کا حکم دیتا ہی ہے۔ اِس حدیث میں بھی کسی لحاظ سے بدکاری کا قصد و ارادہ ثابت نہیں ہوتا۔ اِس

ہیں صرف یہ ہے۔ کہ آپ نے کسی امر کا قصد و ارادہ کیا تھا۔ اور یہ درست ہے جیسا کہ ہم پہلے تحریر کر چکے ہیں۔

بدکاری کا ارادہ بہرکیف نہ تھا۔ صرف گھر کی مالکہ کو زدوکوب کرنے کا ارادہ تھا۔ اور یہ بھی آقا کی خیانت ہے۔ اعتراض باطل ہو گیا۔ اور آیت کے دونوں مفہوم صحیح ثابت ہوئے۔

برہان ربانی

یہاں "برہان ربانی" سے مراد عصمت ونبوت ہے۔ اگر "برہان ربانی نہ ہوتی۔ تو وہ بلاشک بدکاری کا ارادہ کر لیتے ـــــــ ممکن ہے کہ ایسے شخص کا دین تباہ ہو جائے۔ جو ایک برگزیدہ مقدس رسول کیطرف تو گھناؤنے فعل کی نسبت کرتا ہے۔ اور خود اپنی ذات کو اس سے پاک سمجھتا ہے۔

اور نبی علیہ السّلام نے بھی ایسے شخص کی ہلاکت کا اندیشہ ظاہر کیا تھا۔ جو آپ کی نسبت کوئی بدگمانی رکھے۔ چنانچہ ایک دفعہ جبکہ آپ کو دو انصاریوں نے ایک تنہا عورت کے ہمراہ دیکھا۔ تو اُن کے دل میں آپ کے متعلق بدگمانی پیدا ہونے کا اندیشہ تھا۔ کہ نامعلوم عورت کون ہے؟ تو آپؐ نے انہیں مخاطب کر کے فرمایا یہ میری بیوی صفیہؓ ہے۔

جس شخص کے پیش نظر یہ آیت ہو کَذٰلِکَ لِنَصْرِفَ عَنْہُ السُّوْٓءَ وَالْفَحْشَآءَ (۱۲ - ۲۴) اور اسی طرح ہم نے کیا تاکہ پھیر دیں۔ اس سے بُرائی اور بے حیائی کو، محال ہے۔ کہ وہ حضرت یوسفؑ کی نسبت زنا کے ارادہ کا گمان کرے

ہم منکر عصمت سے دریافت کرتے ہیں۔ کہ "قصد زنا" کا کیا مطلب

سمجھتا ہے۔ وہ سوء (برائی) ہے۔ یا غیر شُور (نیکی) اگر اُس نے غیر شُور (نیکی) کہا تو یہ خلاف دانش واجماع ہے۔ کیونکہ وہ متفقہ طور پر سب کے نزدیک بُرائی ہے۔ اور برائی سے اللہ تعالیٰ نے اُن کو پاک رکھا ہے تو یقیناً "قصد برائی" سے بھی اُن کو باز رکھا ہے . . . . نیز جبکہ عزیز کی بیوی نے کہا تھا (جو تیری بیوی کے ساتھ برائی کا ارادہ کرے۔ اس کی کیا سزا ہے) ۱۲-۲۵) تو حضرت یوسفؑ نے بُرائی کے ارادہ کا فوراً انکار کیا۔ اور ایک حق پرست گواہ نے فیصلہ کن بات کہی۔ کہ اگر یوسفؑ کا قمیص پیچھے سے پھٹا ہے۔ تو عورت جھوٹی اور وہ سچے لہٰذا قرآن سے ثابت ہے کہ عورت جھوٹی ہے ۔

اور جب قرآن سے اس کا کذب ثابت ہو گیا۔ تو معلوم ہوا۔ کہ حضرت یوسف نے ہرگز اُس سے برائی کا ارادہ نہیں کیا۔ پس واضح ہو گیا۔ کہ زنا کا ارادہ بالکل نہیں کیا۔ معاذ اللہ) اگر آپ زنا کا ارادد کرتے تو وہ سچی ہوتی۔

اِسی طرح حضرت یوسف علیہ السّلام کے متعلق یہ آیت بھی مذکور ہے کہ

اِلَّا تَصْرِفْ عَنِّیْ کَیْدَهُنَّ اَصْبُ اِلَیْهِنَّ وَ اَکُنْ مِّنَ الْجٰهِلِیْنَ ۝ فَاسْتَجَابَ لَهٗ رَبُّهٗ فَصَرَفَ عَنْهُ کَیْدَهُنَّ (۱۲-۳۴)

خدایا! اگر تو اِن عورتوں کے مکر مجھ سے دُور نہ رکھے گا۔ تو میں اِن کی طرف مائل ہو جاؤں گا۔ اور جاہلوں میں ہو جاؤں گا۔"

اللہ تعالیٰ نے اُن کی دعا قبول کی۔ اور انہیں عورتوں کے مکر سے دُور رکھا لہٰذا واضح ہو گیا۔ کہ حضرت یوسف علیہ السّلام کبھی زوجہ عزیز کیطرف مائل نہیں ہوئے۔

موسیٰ علیہ السلام اور اُن کی والدہ

منکرین عصمت نے اِس آیت سے استدلال لیا ہے۔ کہ "فَارِغًا" سے مراد "بے قرار" اور "بے چین" ہے ۔ اور یہ خلاف عصمت اور خلاف حکم خداوندی ہے ۔

کہ اُمِ موسیٰ کا دِل اِس سے فارغ اَصْبَحَ فُؤَادُ اُمِّ مُوْسٰی فَارِغًا اِنْ
ہوگیا۔ اگر ہم اُس کے دِل کو کَادَتْ لَتُبْدِیْ بِہٖ لَوْلَآ اَنْ رَّبَطْنَا
کو مضبوط نہ کئے ہوتے تو عجب نہ عَلٰی قَلْبِھَا (۲۸ - ۱۰)
تھا۔ کہ وہ ہمارا معاملہ ظاہر کر دیتیں ۔

دَراصل " فارغاً کے معنی ہیں ۔ موسیٰؑ کے غم سے یکسر خالی اور بے فکر ہو جانا ۔ اِس لئے اللہ تعالیٰ نے ان سے حضرت موسیٰ کی واپسی کا وعدہ کرلیا تھا۔
اِنَّا رَآدُّوْہُ اِلَیْکِ (۲۸ - ۷)

محال ہے۔ کہ اللہ تعالیٰ تو اس کی واپسی کا ذمہ دار ہو اور پھر بھی ان کی وَالدہ کا دِل مضطرب اور بیقرار ہو۔ کسی ہوشمند پہ ایسا گمان کرنا محال ہے
اِنْ کَادَتْ لَتُبْدِیْ بِہٖ " کے معنی ہیں کہ فرطِ انبساط سے خدا کے فضل ونوازش کو ظاہر کر دیتیں ۔

اُمِّ موسیٰ کا اِس کی بہن سے کہنا۔ کہ تُو اس کے پیچھے پیچھے جا (۲۸-۱۱)
یہ روانگی بذریعہ الہام تھی ۔ اِس لئے کہ بہن شیر خوار بھائی کے دشمن کے قبضہ میں آجانے کے بعد رہائی کا منظر اور قدرت الٰہی کا کرشمہ اپنی آنکھوں سے جاکر دیکھے ۔ اور اِس کی واپسی کے وعدۂ الٰہی کی تکمیل کا باعث بنے

معترضین نے حضرت موسیٰؑ کے متعلق یہ آیت پیش کی ہے۔ کہ بھائی کے سر کے بال پکڑ کر اپنی طرف گھسیٹا۔ تو حضرت ہارونؑ نے کہا۔ " يَابْنَ اُمَّ لَا تَاْخُذْ بِلِحْيَتِیْ وَلَا بِرَاْسِیْ اے میرے بھائی میری ڈاڑھی اور سر کے بال نہ پکڑیئے۔

منکرین عصمت کہتے ہیں۔ کہ بے گناہ بزرگ سال اپنے جیسے نبی کی ڈاڑھی اور سر کے بال نوچنا معصیت ہے۔

یہ بھی برخود غلط لوگوں کے خیال کے مطابق نہیں۔ آیت کے دو معنی ہو سکتے ہیں

۱۔ موسیٰ علیہ السلام کا بھائی کے سر کو پکڑنا، اپنی جانب متوجہ کرنے اور ڈانٹ پلانے کی خاطر تھا۔ کہ جب اُن کو "بے راہ" سمجھا تو میرے پیچھے آنے اور تلاش کرنے میں تاخیر کیوں کی۔ اور سر کے بال بالکل نہیں پکڑے کہ یہ آیت میں مذکور نہیں۔ اور جو شخص آیت میں اضافہ کرے وہ مفتری اور بہتان تراش ہے۔

البتہ ہارون علیہ السلام نے جب حضرت موسیٰؑ کا غصہ تیز ہوتے دیکھا۔ اور اُن کے حملے اور جلد بازی کا اندیشہ پیدا ہوا۔ تو "یا ابن اُم" کہہ کر اُن کے غیظ و غضب کو فرو کرنے کا ارادہ کیا تھا اِس آیت میں ہمارے بیان کردہ مفہوم کے خلاف کوئی بات نہیں جس سے منکرین عصمت کے قول کی تائید ہوتی ہو۔

۲۔ حضرت موسیٰؑ کے نزدیک ہارون علیہ السلام قابل تنبیہ تھے۔ کہ اُن کے گمراہ ہوتے وقت مجھے خبر کرنے میں تاخیر کیوں کی؟ لہٰذا بطور تنبیہ و سرزنش اُن کا سر پکڑا۔ اور یہ محض اللہ تعالیٰ کی خوشنودی اور

اُس کی خاطر ناراضگی، کی بنا پر ہوا۔ اور ایسے ہم انبیاء سے بعید نہیں سمجھتے ہم تو محض معصیت کا علم ہوتے ہوئے، معصیت کا ارادہ کرنا، انبیاء کے شایانِ شان نہیں سمجھتے۔ (کیونکہ یہ عصمت کے منافی ہے)

حضرت ابراہیم علیہ السلام کے متعلق اِسی قسم کی بلا ارادہ غلطی اِس آیت میں مذکور ہے۔ وَالَّذِیْٓ اَطْمَعُ اَنْ یَّغْفِرَ لِیْ یَوْمَ الدِّیْنِ، وہ ذات جس سے مَیں اُمید رکھتا ہوں کہ وہ روزِ جزا میری خطا معاف کرے گی۔

اور نبی علیہ السّلام کے بارے میں بھی مذکورہ بالا قسم کی غلطی اور خطا اِس آیت میں مذکور ہے۔ لِیَغْفِرَ لَکَ اللّٰہُ مَا تَقَدَّمَ مِنْ ذَنْبِکَ وَمَا تَاَخَّرَ (۴۸ - ۲) تاکہ تمہارے اگلے پچھلے گناہ بخش دے۔

مذکورہ بالا خطا اور معاف شدہ گناہ صرف وہی ہیں، جو سہو و نسیان یا بقصدِ خیر خواہی صادر ہوئے۔ مگر رضاءِ الٰہی کے اعتبار سے وہ خلافِ اولیٰ تھے

حضرت موسیٰؑ کا اعتراض

منکر عصمت نے اِس آیت میں بیان کردہ حضرت موسیٰؑ کے اِس اعتراض کو خلافِ عصمت سمجھا ہے۔ اَقَتَلْتَ نَفْسًا زَکِیَّۃً بِغَیْرِ نَفْسٍ (۱۸ - ۷۴) کہ تو نے ایک بیگناہ بچے کو بلا وجہ قتل کیا یہ حضرت موسیٰ علیہ السّلام کی نادانی تھی۔ کیونکہ خضرؑ ان سے عہد لے چکے تھے۔ کہ وہ کسی بات پر اعتراض نہیں کریں گے۔ جبتک وہ خود نہ بتا دیں۔

یہ اعتراض بھی فرسودہ اور لایعنی ہے۔ اِس لیے کہ یہ سوال اُنہوں نے بھول کر کیا تھا۔ مُوسیٰ علیہ السّلام نے اِس کا اعتراف کیا ہے۔ لَا تُؤَاخِذْنِیْ بِمَا نَسِیْتُ (۱۸ - ۷۳) کہ نسیان پر میری گرفت نہ کیجئے۔ یعنی حضرت موسیٰؑ

نے خضر علیہ السّلام سے درخواست کی۔ کہ وہ بھول چوک پہ گرفت نہ کریں نسیان پر حضرت خضر علیہ السلام کا حضرت موسٰی علیہ السلام سے مؤاخذہ اور گرفت کرنا، اِس بات کی دلیل ہے۔ کہ انبیاء سے سہو و نسیان پر بھی گرفت ہوتی ہے۔ نیز ہر ایک فعل پر جو بقصد خیر ہو۔ مگر رضائے الٰہی کے اعتبار سے وہ خلاف اولٰے ہو۔

موسٰی علیہ السّلام نے "ظاہر خیال" کی بنا پہ اعتراض کیا۔ اور لڑکے کو بے گناہ سمجھا۔ اِس لئے کہ اُس کا کوئی گناہ معلوم نہ تھا۔ البتہ خضرؑ کو اِس لڑکے کے کفر اور اِستحقاق قتل کا "لدنی علم" تھا۔ اور حضرت موسٰیؑ نے یہ سوال محض اللہ تعالٰی کی رضا و رحمت اور قتل کا اصل سبب معلوم کرنے کی خاطر کیا تھا۔

اِعتراف قتل

منکرین عصمت نے اِس آیت سے بھی استدلال لیا ہے۔ فَعَلْتُهَا وَاِذْ "اَوَاَنَا مِنَ الضَّالِّيْنَ (۲۶ - ۲۵)

"جب میں نے یہ کام کیا تھا۔ تو میں بے خبر تھا" —— یہ بات درست ہے۔ لیکن یہ واقعہ اُن کا نبوت سے پہلے کا ہے۔ کیونکہ وہ اِن علوم سے غافل تھے۔ جن کی طرف نبوت کے بعد اُن کی رہنمائی ہوئی۔

ضلال کے معنی اغفلت اور حرمان علم کے ہیں۔ محاورہ ہے' اَضْلَلْتُ بَعِیْرِیْ "مجھے میرے اونٹ کا پتہ نہیں۔ اور ضلال کا معنی قصد گناہ ہرگز نہیں۔ اِسی طرح نبی علیہ السّلام کے متعلق آیا ہے۔ وَوَجَدَكَ ضَالًّا فَهَدٰى (۹۳ - ۷) کہ نور نبوت سے محروم پا یا تو رہنمائی کر دی۔ یعنی اس رہنمائی سے قبل نبوت و رسالت کے علم و

سے محروم تھے۔

معترضین نے اِس سلسلہ میں یہ آیت نقل کی ہے۔ فَقَالُوْٓا اَرِنَا اللّٰہ
انہوں نے کہا کہ اللہ ہمیں کھلم کھلا   فَقَالُوْٓا اَرِنَا اللّٰہَ جَہْرَۃً فَاَخَذَتْ
دکھاؤ۔ تو اُن کے مجرمانہ سوال کی   ھُمُ الصّٰعِقَۃُ بِظُلْمِہِمْ (۴-۱۵۳)
وجہ سے بجلی نے پکڑ لیا۔

پھر خود حضرت موسیٰ علیہ السّلام نے اللہ تعالےٰ کو دیکھنے کا سوال کیا۔ رَبِّ اَرِنِیْٓ اَنْظُرْ اِلَیْکَ۔ (۷-۱۴۳) اَے رب مجھے اپنا آپ دکھا دے۔ تو اللہ تعالےٰ فرمایا۔ تُو مجھے ہرگز نہیں دیکھ سکے گا۔ تو یہ ایک ایسا سوال تھا۔ جس کے خواستگاروں کو اِس سے پہلے سزا مل چکی تھی۔

اِن کا یہ استدلال بھی دو وجہ سے لایعنی اور لغو ہے۔

۱۔ حضرت موسیٰؑ نے درخواست بنی اسرائیل کے سوال سے قبل اور اُن کے اِس سوال کے ناجائز ہونے کی اطلاع سے پہلے کی تھی۔ نیز اس میں قباحت بھی نہیں۔ اِس لئے کہ انہوں نے ایک عظیم فضیلت حاصل کرنے کی درخواست کی تھی۔ جس سے وہ اللہ تعالیٰ کے ہاں عالی منصب کے خواہاں تھے۔

۲۔ اسرائیل کا سوال اللہ کے وجود میں شک وشبہ اور گستاخی کے طور پر تھا۔ لیکن موسیٰ علیہ السّلام کی درخواست عظمت و رفعت کے حصول کے تحت تھی

یُونسؑ علیہ السّلام

منکرین عصمت نے درج ذیل آیات کی روشنی میں حضرت یونس علیہ السّلام کو بھی مورد الزام ٹھہرایا ہے۔

اور مچھلی والے کو جب غصّہ ہو کر   وَذَا النُّوْنِ اِذْ ذَّھَبَ مُغَاضِبًا فَظَنَّ

چلاگیا۔ پھر خیال کیا۔ کہ ہم اُسے نہیں پکڑینگے۔ پھر اندھیروں میں پکارا۔ کہ تیرے سوا کوئی معبود نہیں۔ تو بے عیب ہے۔ بیشک میں ظالموں میں سے تھا۔

اَنْ لَّنْ نَّقْدِرَ عَلَيْهِ فَنَادٰى فِى الظُّلُمٰتِ اَنْ لَّآ اِلٰهَ اِلَّآ اَنْتَ سُبْحٰنَكَ اِنِّىْ كُنْتُ مِنَ الظّٰلِمِيْنَ (۲۱ - ۸۷) فَالْتَقَمَهُ الْحُوْتُ وَهُوَ مُلِيْمٌ فَلَوْلَآ اَنَّهٗ كَانَ مِنَ الْمُسَبِّحِيْنَ ۝

پھر مچھلی نے اُن کو نگل لیا۔ اور وہ قابل ملامت کام کرنے والے تھے۔ پھر اگر (خدا کی) پاکی بیان نہ کرتے تو اُس روز تک کہ لوگ دوبارہ زندہ کیے جائیں گے اس کے پیٹ میں رہتے۔ لَلَبِثَ فِىْ بَطْنِهٖۤ اِلٰى يَوْمِ يُبْعَثُوْنَ (۳۷ - ۱۴۴)

تو اپنے رب کے حکم کے انتظار میں صبر کیے رہو۔ اور مچھلی والے کیطرح نہ ہونا۔ کہ انہوں نے خدا کو پکارا۔ اور غم و غصہ سے بھرے

فَاصْبِرْ لِحُكْمِ رَبِّكَ وَلَا تَكُنْ كَصَاحِبِ الْحُوْتِ اِذْ نَادٰى وَهُوَ مَكْظُوْمٌ لَوْلَآ اَنْ تَدٰرَكَهٗ نِعْمَةٌ مِّنْ رَّبِّهٖ لَنُبِذَ بِالْعَرَآءِ وَهُوَ مَذْمُوْمٌ (۶۸/۴۸)

ہوئے تھے۔ اگر تمہارے رب کی نعمت اُن کی یاوری نہ کرتی تو وہ چٹیل میدان میں ڈال دیئے جاتے۔ اور اُن کا حال اَبتر ہو جاتا۔ (۶۸ - ۴۸)

معترضین کہتے ہیں۔ کہ اللہ تعالےٰ ناراض کرنا عظیم ترین گناہ ہے اور اس شخص سے کون زیادہ گناہ گار ہو سکتا ہے۔ جو یہ سمجھے کہ اللہ تعالیٰ اس پر قادر نہیں۔ نیز اللہ تعالےٰ نے فرمایا ہے۔ کہ وہ قابل مذمت و ملامت تھے۔ اگر اللہ تعالیٰ کا فضل و کرم اُن کی دستگیری نہ کرتا۔ اور ظالم ہونے کا اُنہوں نے خود اعتراف کیا ہے۔ اور نبی علیہ السلام کو اُن کی مانند ہونے

سے منع فرمایا گیا ہے ۔

اُن سے یہ تمام استدلات ناقابل قبول ہیں۔ بلکہ بحمد اللہ یہ ہمارے موقف کی تائید کرتے ہیں ۔

یونسؑ کی ناراضگی

یہ آیت " کہ حضرت یونس علیہ السلام غصہ ہوکر چلے گئے ۔ اِس میں انہوں نے اللہ تعالیٰ کو قطعاً ناراض نہیں کیا ۔ اور نہ ہی اللہ تعالیٰ نے یہ فرمایا ہے ۔ کہ اِس سے اللہ تعالیٰ کو ناراض کر دیا تھا ۔ جو اِس کا اضافہ کریگا وہ اللہ تعالیٰ پر افترا ، اور قرآن میں اپنی جانب سے اضافہ کریگا ۔

ایک معمولی انسان خداوند تعالےٰ کی ناراضگی پسند نہیں کریگا ۔ تو ایک نبی سے اِس کی کسطرح توقع کی جاسکتی ہے . . . . . لہذا معلوم ہوا ۔ وہ قوم سے ناراض ہوگئے تھے ۔ لیکن ان کی یہ ناراضگی رضائے الٰہی کے موافق نہ ہوئی ۔ چنانچہ مورد عتاب ہوئے ۔

بے بسی

فَظَنَّ اَنْ لَّنْ نَّقْدِرَ عَلَيْهِ (۲۱ - ۸۷)

پس اُس نے گمان کیا ہم اس پر قادر نہیں ہیں

آیت کا مفہوم معترضین کے خیال کے قطعاً موافق نہیں ۔ یہ ایسا بے ہودہ خیال ہے ۔ جو کسی سالخوردہ و پیر فرتوت کے متعلق بھی روا نہیں ۔ اِلا یہ کہ وہ جہالت کی آخری حدود پھلانگ چکا ہو چہ جائیکہ ایسا ظن ایک نبی پر کیا جائے جو علم وفضل میں لوگوں سے برتر ہو ۔

محال ہے۔ کہ کوئی نبی جس کو اللہ تعالیٰ اپنے دین کا پیامبر بنائے۔ وہ یہ گمان کرے۔ کہ اللہ تعالیٰ اُس پر قادر نہ ہو گا۔ حالانکہ اُسے معلوم ہے کہ اُس جیسا ایک معمولی آدمی اُس پر قابو پا سکتا ہے۔ جو شخص ایسی "بدگمانی" کی نسبت ایک افضل و مقدس رسول کی طرف کرتا ہے۔ یقیناً اگر یہی بدگمانی اُس کی طرف منسوب کی جائے۔ تو غصے سے لال پیلا ہو جائے۔ تو پھر اسے ایسی بات یونس علیہ السّلام کیطرف منسوب کرنا کیونکر مناسب ہے۔ جس کے متعلق خود نبی صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا ہے۔ "لَا تُفَضِّلُوْنِی عَلٰی یُوْنُسَ بْنِ مَتّٰی" مجھے یونسؑ سے افضل مت کہو لہٰذا یہ اعتراض باطل ہے۔

"لَنْ نَقْدِرَ عَلَیْہِ" کے معنی ہیں۔ "لَنْ نُضَیِّقَ عَلَیْہِ" یعنی ہم اُن پر تنگی نہ کریں گے۔ جیسا کہ اللہ تعالیٰ نے فرمایا۔ اَمَّا اِذَا مَا ابْتَلٰہُ فَقَدَرَ عَلَیْہِ رِزْقَہٗ "جب اللہ اس کی آزمائش کرتا ہے۔ تو اس پر اس کا رزق تنگ کر دیتا ہے۔ یعنی "قدر" بمعنی "تنگی" ہے۔ مطلب یہ ہوا۔ کہ حضرت یونس علیہ السّلام کا خیال تھا۔ کہ اللہ تعالیٰ انہیں اپنی قوم سے ناخوش ہونے پر کسی تنگی میں نہ ڈالیں گے۔ اس لئے کہ وہ بزعم خود اپنے اس کارنامے میں راستی اور رضائے الٰہی کے طالب تھے۔

اللہ تعالیٰ نے جو نبی علیہ السّلام کو مچھلی والے کی مانند ہونے سے منع فرمایا ہے۔ بالکل درست ہے۔ اللہ تعالیٰ نے آنحضرتؐ کو

اپنی قوم سے ناراض ہونے سے منع فرمایا ہے۔ اُن کی ایذاء رسانی پر صبر و سکون اور اُن پر رحم و کرم کرنے میں سبقت لے جانیکا حکم فرمایا۔

مذمّت

یہ خیال کہ وہ مذمت و ملامت کے مستوجب تھے اور خدا کا رحم و کرم اُن کی دستگیری نہ کرتا۔ تو بطور سزا ہمیشہ مچھلی کے پیٹ میں رہتے۔

یہی ہم کہتے ہیں۔ کہ انبیاء علیہم السّلام پر دُنیا میں ہی ایسے امور پر مؤاخذہ ہو جاتا ہے۔ جن کو وہ خیر اور تقرب الٰہی کا ذریعہ خیال کرتے ہیں۔ مگر خلاف رضائے الٰہی ہونے کے باعث اللہ کی ناراضگی کا موجب بنتے ہیں۔ اور اسی بنا پر انہوں نے اپنے ظالم ہونے کا اعتراف کیا۔ کیونکہ "ظلم" کسی چیز کو اس کے غیر محل میں رکھنے کا نام ہے جب انہوں نے اپنی ناراضگی کو غیر شعوری طور پر بلا ارادہ غیر محل میں ظاہ فرمایا۔ تو اِس بنا پر ظلم کا اعتراف کیا۔

حضرت داؤد علیہ السّلام

معترضین نے داؤد علیہ السّلام کے متعلق درج ذیل آیت سے استدلا کیا ہے۔

بھلا تمہارے پاس اُن جھگڑنے والوں کی خبر آئی ہے۔ جب وہ

هَلْ اَتٰكَ نَبَؤُا الْخَصْمِ اِذْ تَسَوَّرُوا الْمِحْرَابَ اِذْ دَخَلُوْا عَلٰى دَاوٗدَ

دیوار پھاند کر عبادت خانے میں داخل فَفَزِعَ مِنْهُمْ فَقَالُوْا لَا تَخَفْ
ہوئے۔ جس وقت داؤد کے پاس آئے خَصْمٰنِ بَغٰى بَعْضُنَا عَلٰى بَعْضٍ
تو وہ اُن سے گھبرا گئے۔ اُنہوں نے کہا۔ کہ خوف نہ کیجئے ہم دونوں کا ایک مقدمہ
ہے۔ کہ ہم میں سے ایک نے دُوسرے پر زیادتی کی ہے۔
تو آپ ہمارا فیصلہ کر دیجئے انصاف کا فَاحْكُمْ بَيْنَنَا بِالْحَقِّ وَلَا تُشْطِطْ
اور بے انصافی نہ کیجئے گا۔ اور ہم کو وَاهْدِنَآ اِلٰى سَوَآءِ الصِّرَاطِ اِنَّ
سیدھا راستہ دکھا دیجئے (کیفیت هٰذَآ اَخِيْ لَهٗ تِسْعٌ وَّتِسْعُوْنَ
یہ ہے) کہ یہ میرا بھائی ہے۔ اس نَعْجَةً وَّلِيَ نَعْجَةٌ وَّاحِدَةٌ
کے پاس ننانوے دُنبیاں ہیں۔ فَقَالَ اَكْفِلْنِيْهَا وَعَزَّنِيْ فِي
اور میرے پاس ایک دُنبی ہے الْخِطَابِ قَالَ لَقَدْ ظَلَمَكَ بِسُؤَالِ
یہ کہتا ہے۔ کہ یہ بھی میرے حوالے نَعْجَتِكَ اِلٰى نِعَاجِهٖ وَاِنَّ كَثِيْرًا
کر دو اور گفتگو میں مجھ پر زیادتی مِّنَ الْخُلَطَآءِ لَيَبْغِيْ بَعْضُهُمْ عَلٰى
کرتا ہے۔ اُنہوں نے کہا۔ یہ جو بَعْضٍ اِلَّا الَّذِيْنَ اٰمَنُوْا وَعَمِلُوا
تیری دُنبی مانگتا ہے۔ کہ اپنی دُنبیوں الصّٰلِحٰتِ وَقَلِيْلٌ مَّا هُمْ وَظَنَّ دَاوٗدُ
میں ملا لے بیشک تم پر زیادتی اَنَّمَا فَتَنّٰهُ فَاسْتَغْفَرَ رَبَّهٗ وَخَرَّ
ہی کیا کرتے ہیں۔ ہاں جو ایمان رَاكِعًا وَّاَنَابَ فَغَفَرْنَا لَهٗ ذٰلِكَ
لائے۔ اور نیک عمل کرتے رہے وَاِنَّ لَهٗ عِنْدَنَا لَزُلْفٰى وَحُسْنَ
اور ایسے لوگ بہت کم ہیں۔ اور مَاٰبٍ (۳۸ - ۲۴)
داؤدؑ نے خیال کیا۔ کہ ہم نے اُنہیں آزمایا ہے۔

اور جھک کر گر پڑے ۔ اور رجوع کیا ۔ تو ہم نے انہیں بخش دیا ۔ بیشک اُن کے لئے ہمارے پاس عمدہ مقام اور قرب ہے ۔

یہ واقعہ بالکل صحیح اور درست ہے ۔ مسخروں ، جھوٹوں اور یہود کی خود ساختہ روایات اور خرافات سے استدلال کرنیوالوں کے لئے اس واقعہ میں کوئی دلیل نہیں ۔

اصل مفہوم

آیت کے ظاہر الفاظ سے معلوم ہوتا ہے ۔ کہ اہل مقدمہ تھے ۔ وہ اپنی اپنی بھیڑوں کے تنازع میں آپ سے فیصلہ کروانا چاہتے تھے ۔

جس کا خیال ہے ۔ کہ " خصمان " ملائکہ تھے ۔ اور " نعجہ " کے لفظ سے عورتوں کے تنازعہ کی طرف تعریض کر رہے تھے ۔ اُس نے اللہ تعالیٰ پر بہتان لگایا ۔ افترا پردازی کی ۔ قرآن میں اضافہ کیا ۔ اللہ تعالیٰ کی تکذیب کی ۔ اور ملائکہ کی غلط بیانی کا اعتراف کیا ۔ اِس لئے اللہ تعالیٰ فرماتا ہے ۔ هَلْ اَتَاكَ نَبَأُ الْخَصْمِ ، کیا آپ کو اہل مقدمہ کا واقعہ معلوم ہے ۔

اور معترض کہتا ہے ۔ کہ اہل مقدمہ انسان نہ تھے ۔ نہ ایک نے دوسرے پر ظلم کا ارتکاب کیا ۔ نہ کبھی ایک کی ننانوے بھیڑیں اور نہ دوسرے کی ایک تھی ۔ اور ایک نے دوسرے سے کہا ۔ کہ یہ ایک بھی مجھے دے دو ۔

حیرت ہے کہ اہل باطل خود کو اس بات میں کیوں تباہ و برباد کر رہے ہیں ۔ مزید برآں یہ دعویٰ بلا دلیل و برہان ہے ۔

بخدا ہر مسلمان اپنی ذات کو اور اپنے پاکدامن ہمسایہ کو اس بات سے محفوظ و مصئون رکھتا ہے۔ کہ ہمسایہ کی بیوی سے آنکھ لڑائے۔ اور پھر اُس سے شادی رچانے کی غرض سے اُس کے شوہر کو قتل کرائے ـــــ نیز ہر شخص محض ایک پرندہ دیکھ کر نماز ترک کرنے سے بھی خود کو بالا و برتر سمجھتا ہے ایسے افعال و کردار، فاسقوں، فاجروں، احمقوں اور لاابالی افراد سے تو سرزد ہو سکتے ہیں۔ اہل ورع و تقویٰ کا اُن سے دُور کا بھی واسطہ نہیں ہو سکتا۔ چہ جائیکہ ایک رسول سے منسوب کئے جائیں۔ جو مظہر وحی الٰہی اور کلام الٰہی کا قاری ہو۔

اللہ تعالےٰ نے انہیں ایسا پاکیزہ نفس عطا کیا ہوتا ہے۔ کہ ایسے فحش خیالات کا ان کے دل و دماغ میں تصور تک نہیں آسکتا۔ تو پھر یہ اُن سے سرزد کیسے ہو سکت ہے۔

اِستغفار و سجُود

حضرت داؤد علیہ السلام کا اِستغفار کرنا، سجدہ ریز ہونا، اور اللہ تعالےٰ کا انہیں معاف کر دینا، یہ گناہگاری اور غلط کاری کا ثبوت نہیں بلکہ فرائض منصبی کے لحاظ سے انبیاء کرام کی شان یہی ہے۔ نیز استغفار ایک کار خیر ہے۔ جو انبیاء و ملائکہ، گناہ گار و بے گناہ سے مستبعد نہیں۔ بلکہ انبیاء و ملائکہ تو روئے زمین کے گنہگاروں کیلئے استغفار کرتے ہیں۔

يَسْتَغْفِرُونَ لِلَّذِينَ آمَنُوا رَبَّنَا وَسِعْتَ كُلَّ شَيْءٍ رَّحْمَةً وَعِلْمًا فَاغْفِرْ لِلَّذِينَ تَابُوا وَاتَّبَعُوا سَبِيلَكَ وَقِهِمْ عَذَابَ الْجَحِيمِ ۞

آزمائش کا خدشہ

حضرت داؤد علیہ السّلام کے متعلق معترض نے درج ذیل آیت نقل کی ہے "ظنّ داؤد انّما فتناہ" کہ حضرت داؤد علیہ السّلامؑ کو خیال گزرا۔ کہ ہم (اللہ) نے اُس کی آزمائش کی ہے۔ (۳۸ - ۲۴) پھر مغفرت کی دُعا کی۔ پھر ہم نے اُسے معاف کر دیا۔

داؤد علیہ السّلام کے دل میں خیال آیا۔ کہ جو انہیں ایسی وسیع سلطنت مرحمت ہوئی ہے۔ وہ فتنہ و آزمائش ہے۔ پھر انہوں نے اِس بدگمانی سے مغفرت کی دُعا کی۔ تو اللہ تعالےٰ نے معاف فرما دیا۔ اِس لئے کہ وہ سلطنت فتنہ و آزمائش نہ تھی۔ (بلکہ اللہ تعالےٰ کا فضل و انعام تھا اُس طرح رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم بھی دُعا فرمایا کرتے تھے۔ کہ اللہ تعالےٰ اِن کے دل کو دین پر قائم رکھے۔

سُلیمان علیہ السّلام

معترضین نے حضرت سلیمانؑ کے واقعہ پر بھی اعتراض کیا ہے۔ کہ

اور ہم نے سلیمانؑ کو آزمایا۔ اور	وَلَقَدْ فَتَنَّا سُلَیْمٰنَ وَ اَلْقَیْنَا
ہم نے اُس کے تخت پر ایک دھڑ	عَلٰی کُرْسِیِّہٖ جَسَدًا ثُمَّ اَنَابَ
ڈال دیا۔ پھر انہوں نے خدا کی طرف رجوع کیا	(۳۸ - ۳۴)

فِتنہ سلیمانؑ

یہ اعتراض بھی منکرین عصمت کے لئے قابل حجت نہیں ہو سکتا۔ اِس لئے کہ "فتنا سُلیمان" کے معنی یہ ہیں کہ خدا نے انہیں سلطنت عطا کر کے اُن کی اطاعت شعاری کا امتحان لیا جیسا کہ خدا تعالیٰ نے حضرت موسیٰ علیہ السّلام کا مقولہ نقل فرمایا ہے کہ

یہ محض تیرا فتنہ و آزمائش ہے	اِنْ ھِیَ اِلَّا فِتْنَتُکَ تُضِلُّ بِھَا مَنْ

جسے چاہتا ہے گمراہ کرتا ہے۔ تَشَآءُ وَتَهْدِیْ مَنْ تَشَآءُ (۷-۱۵۵)
اور جسے چاہتا ہے سرفراز فرماتا ہے۔ (۷ - ۱۵۵)

اور بعض فتنے ہدایت کا باعث بھی ہوتے ہیں۔ اللہ تعالیٰ نے فرمایا ہے۔

کیا لوگ یہ خیال کرتے ہیں کہ اَحَسِبَ النَّاسُ اَنْ یُّتْرَکُوْٓا اَنْ یَّقُوْلُوْٓا
صرف یہ کہنے سے کہ ہم ایمان اٰمَنَّا بِاللّٰهِ وَهُمْ لَا یُفْتَنُوْنَ وَلَقَدْ
لے آئے چھوڑ دیئے جائیں فَتَنَّا الَّذِیْنَ مِنْ قَبْلِهِمْ وَلَیَعْلَمَنَّ
گے۔ اور اُن کی آزمائش نہ اللّٰهُ الَّذِیْنَ صَدَقُوْا وَلَیَعْلَمَنَّ الْکٰذِبِیْنَ
ہو گی۔ اور ہم نے سابقہ لوگوں کی آزمائش کی۔ سو خدا ان کو ضرور معلوم کریگا
جو سچے ہیں۔ اُن کو بھی اور جو جھوٹے ہیں۔ (۲۹ - ۱)

جیسا کہ یہ "فتنہ" امتحان و آزمائش تھا۔ کہ ہدایت یافتہ گمراہ سے ممتاز اور جُدا ہو جائے۔ اسیطرح سلیمانؑ بھی فتنہ میں مبتلا ہوئے۔ اور کامیاب رہے ـــــ علاوہ ازیں سب غلط توجیہات ہیں۔ جو بے دین یہود اور اُن کے ہمنواؤں کی اختراع کردہ ہیں۔

جسد

سلیمان علیہ السلام کی کرسی کے اُوپر جو "دھڑ" ڈال دیا گیا تھا۔ اُس سے جو کچھ اللہ تعالیٰ کا مقصد تھا۔ وہ پورا حاصل ہوا۔ اور ہم "بعینہٖ" اُس پر ایمان رکھتے ہیں کہ یہ سب کچھ من جانب اللہ ہے۔ اگر قرآن یا حدیث میں اِس "جسد" کی تشریح و تعبیر منقول ہوتی تو ہم اِس کے قائل ہوتے۔ جبکہ اِس کی تفسیر میں کوئی صحیح یث منقول نہیں ہے۔ تو کسی کے لئے بھی ظن و تخمین سے جو بدترین جھوٹ ہے تفسیر کرنا روا نہیں۔ کیونکہ یہ اللہ تعالیٰ پر افترا اور بہتان تراشی ہے۔

موضوع

ہمیں کسی کے اِس قول کے غلط اور باطل ہونے میں کہ وہ ایک جن تھا۔ سلیمان علیہ السّلام کا روپ دھار گیا تھا۔ ذرّہ برابر شک نہیں۔ کیونکہ اللہ تعالیٰ اپنے رسول کو ایسے رسوا نہیں کیا کرتا۔

اسی طرح ہم اس موضوع روایت کی بھی تردید کرتے ہیں۔ کہ حضرت سلیمانؑ نے اپنا ایک لڑکا تربیت کے لئے کسی بادل کے سپرد کیا تھا کیونکہ حضرت سلیمانؑ اس قدر نادان نہ تھے۔ کہ فطری غذا۔ دودھ اور کھانا چھوڑ کر غیر طبعی طریق سے اپنے بچے کی پرورش کراتے۔ نیز یہ دونوں روایات خرافات اور خود ساختہ ہیں۔ اِن کی سند قطعًا درست نہیں۔

محبت

منکرین عصمت نے حضرت سلیمان علیہ السّلام کے متعلق یہ آیت بھی پیش کی ہے۔

"کہ میں نے اپنے پروردگار کی یاد　اِنِّیْ اَحْبَبْتُ حُبَّ الْخَیْرِ عَنْ ذِکْرِ رَبِّیْ
سے غافل ہو کر مال کی محبت اختیار　حَتّٰی تَوَارَتْ بِالْحِجَابِ رُدُّوْهَا عَلَیَّ
کی یہاں تک کہ آفتاب پردے میں　فَطَفِقَ مَسْحًا بِالسُّوْقِ وَالْاَعْنَاقِ
چھپ گیا۔ اُن کو میرے پاس واپس لے آؤ۔ پھر اُن کی ٹانگوں اور گردنوں پر ہاتھ پھیرنے لگے۔"

اس آیت کا وہ مطلب بتایا ہے۔ کہ جس سے اللہ تعالیٰ نے معمولی ہوشمند آدمی کو بھی محفوظ رکھا ہے۔ تو پھر ایک برگزیدہ اور معصوم نبی کس طرح گھوڑوں کو قتل کرسکتا ہے۔ اور نماز سے غافل ہو سکتا ہے؟

یہ محض ایک خود ساختہ جھوٹا قصہ ہے۔ جو کسی بے دین کی اختراع معلوم ہوتا ہے۔ کہ کئی ایک جھوٹ پر مشتمل ہے۔ کیونکہ اس قصے میں بے گناہ

گھوڑوں کو سزا دینا اور ان کا "مُثلہ" کرنا، اور مفید مال کو بلا وجہ غارت کرنا، ایک نبی کو "ترک نماز" سے متہم کرنا، اور پھر خود کردہ گناہ کی گھوڑوں کو کُوٹنا، بیان کیا گیا ہے۔ یہ ایسا واقعہ ہے جسے ایک کمسن بچہ بھی جائز خیال نہیں کرتا۔ چہ جائیکہ ایک برگزیدہ نبی۔

دراصل آیت کا مفہوم و معنی یہ ہے۔ کہ حضرت سلیمانؑ نے بتایا۔ کہ ذکرِ الٰہی کی بنا پر انہیں گھوڑوں سے اس قدر والہانہ محبت تھی۔ کہ دیکھتے دیکھتے سورج غروب ہو گیا یا گھوڑے اصطبل میں چلے گئے۔ پھر ان کی واپسی کا حکم دیا۔ اور ان کی گردنوں اور پنڈلیوں پر دستِ شفقت پھیرنے لگے۔ الغرض کسی احتمال سے آیت کا مفہوم بھی یہی ہے۔ اور ان کے بیان کردہ قصہ کے مطابق اس آیت میں گھوڑوں کے مُثلہ اور ترک نماز کی طرف اشارہ تک نہیں۔ حالانکہ یہ ثقہ مسلمانوں نے بیان کیا ہے۔ ان کے یہ اقوال ناقابل قبول ہیں۔ اس لئے کہ بجز رسول اللہ کسی کا قول حجت نہیں۔

حدیث سلیمانؑ

منکرین نے ایک صحیح حدیث بھی نقل کی ہے۔ کہ سلیمانؑ نے فرمایا۔ امشب بیویوں کے ہاں گزاروں گا۔ بیوی سے ایک ایک جانباز مجاہد پیدا ہوگا۔ لیکن انشاء اللہ نہ کہا

یہ اعتراض حجت نہیں۔ اس لئے کہ مجاہدین کی کثرتِ تعداد کا ارادہ نیک ارادہ اور کارِ خیر ہے۔ لیکن حضرت سلیمانؑ کے متعلق یہ بدگمانی کسی طرح روا نہیں۔ کہ اُن کے خیال میں تھا۔ کہ بچوں کی ولادت مشیتِ ایزدی کے بغیر ہو سکتی ہے۔ اور حدیث میں صاف مذکور ہے۔ کہ وہ "انشاء اللہ" کہنا گئے تھے۔ لہٰذا نسیان کی وجہ سے گرفت ہوئی۔ حالانکہ ارادہ نیک ہی تھا۔

ایک صاحب تصرف

منکرین عصمت نے اس آیت کو بھی خلاف عصمت سمجھا ہے۔

اس شخص کا حال پڑھ کر سنائیں وَاتْلُ عَلَيْهِمْ نَبَأَ الَّذِي آتَيْنَاهُ آيَاتِنَا فَانسَلَخَ
جسے ہم نے اپنی آیات عطا کیں تو مِنْهَا فَأَتْبَعَهُ الشَّيْطَانُ فَكَانَ مِنَ الْغَاوِينَ
اس نے انکو اتار دیا۔ اس کے پیچھے شیطان لگا۔ تو وہ گمراہوں میں ہو گیا (۷-۱۷۵)

اس آیت میں بھی معترضین کے مفید مطلب کوئی بات نہیں کیونکہ کسی آیت اور حدیث سے معلوم نہیں ہوتا۔ کہ یہ واقعہ جس شخص کو پیش آیا وہ کوئی نبی تھا۔ ممکن ہے کہ اس سے کسی عام امتی کو "آیات الٰہی" کی تبلیغ کسی رسول کے ذریعہ ہو۔ اور پھر وہ آیات کی تکذیب کر کے منحرف اور گمراہ ہو گیا۔ جیسے فرعون وغیرہ کو انبیاء کی معرفت تبلیغ ہوئی۔

جب یہ ثابت ہو چکا ہے۔ کہ انبیاء کرام اللہ تعالیٰ کی معصیت کا ارتکاب عمداً نہیں کرتے۔ تو محال ہے اللہ تعالیٰ کسی کو "ناکردہ" فعل پر سزا دے اور یہ نبوت چھین لینے سے بڑھ کر کوئی سزا نہیں۔ اور یہ سزا کسی نبی کے لیئے سزاوار بھی نہیں۔ کیونکہ نبی سے ایسا گناہ صادر ہی نہیں ہوتا۔ جس کے باعث وہ عذاب عظیم کا مستحق ہو۔ اس بات سے عیاں ہے۔ کہ یہ مذکورہ شخص قطعاً نبی نہیں تھا۔

حدیث یحییٰ علیہ السلام

منکرین عصمت نے حسب ذیل حدیث سے بھی استدلال کیا ہے۔ کہ نبی علیہ السلام نے فرمایا۔

کہ یحییٰ علیہ السلام کے علاوہ ہر کسی نے اِنَّ مَا مِنْ اَحَدٍ اِلَّا وَقَدْ اَلَمَّ بِذَنْبٍ
گناہ کا ارتکاب کیا ہے۔ یا گناہ کے اَوْ کَادَ اِلَّا یَحْیَی بْنَ زَکَرِیَّا اَوْ کَمَا قَالَ
قریب پہنچا۔" اَیْ ھَمَّ لٰکِنْ لَا اِثْمَ سے بھی یہی مفہوم نکلتا ہے (مترجم)

یہ حدیث درست ہے۔ اور ہمارے کے عین مطابق ہے۔ ہم پہلے بیان کر چکے ہیں۔ کہ انبیاء علیہ السلام سے سہو و ارادہ خیر سے "لغزش" ہو سکتی ہے۔ اور یہ جو آپؐ نے فرمایا ہے۔ کہ یحییٰؑ کے سوا ہر کسی نے گناہ کا ارتکاب کیا ہے یا گناہ کے قریب پہنچا۔ اس سے صرف یہ ثابت ہوتا ہے۔ کہ حضرت یحییٰؑ اپنے فرائض منصبی کو کبھی نہیں بھولے۔ اور نہ ہی ان سے کوئی ایسا فعل سرزد ہوا جو خلاف رضاء الہٰی ہو۔

آنحضرت محمد صلی اللہ علیہ وسلم

معترضین نے حسب ذیل آیات و احادیث کو بھی خلاف عصمت قرار دیا ہے۔

۱۔ اگر خدا کا حکم پہلے نہ ہو چکا ہوتا۔ تو تمہیں عذاب عظیم پہنچتا

لَوْلَا كِتَابٌ مِّنَ اللّٰهِ سَبَقَ لَمَسَّكُمْ فِيمَا أَخَذْتُمْ عَذَابٌ عَظِيمٌ (۸-۶۸)

۲۔ ترش رو ہوئے اور منہ پھیر بیٹھے کہ ان کے پاس ایک اندھا آیا۔ اور آپ کیا جانیں شاید وہ پاکیزگی حاصل کرتا۔ یا نصیحت پکڑتا اور نصیحت اسے فائدہ دیتی۔ جو پروا نہیں کرتا۔ اس کی طرف آپ توجہ دیتے ہیں۔ حالانکہ اگر وہ نہ سنورے تو آپ پر کوئی الزام نہیں۔ اور جو تمہارے پاس دوڑتا ہوا آیا۔ اور خدا سے ڈرتا ہے۔ اس سے آپ بے رخی برتتے ہیں

عَبَسَ وَتَوَلّٰى أَنْ جَاءَهُ الْأَعْمٰى وَمَا يُدْرِيكَ لَعَلَّهُ يَزَّكّٰى أَوْ يَذَّكَّرُ فَتَنْفَعَهُ الذِّكْرٰى وَأَمَّا مَنِ اسْتَغْنٰى فَأَنْتَ لَهُ تَصَدّٰى وَمَا عَلَيْكَ أَلَّا يَزَّكّٰى وَأَمَّا مَنْ جَاءَكَ يَسْعٰى وَهُوَ يَخْشٰى فَأَنْتَ عَنْهُ تَلَهّٰى (۸۰ - ۱۰)

۳۔ معترضین نبی علیہ السلام کے "سورہ والنجم" کی تلاوت کے سلسلہ میں ایک جھوٹی حدیث پیش کرتے ہیں۔ اور اس میں ایک خانہ ساز اضافہ کرتے

ہیں۔ جو ان کی سیاہ بختی اور کور ذوقی کا آئینہ دار ہے۔ وہ یہ ہے کہ

بیشک یہ "بت" بلند مرتبہ   وَاِنَّھَا الغَرَانِیقُ العُلیٰ وَاِنَّ شَفَا
ہیں۔ اور ان کی شفاعت   عَتَھُنَّ لَتُرتَجیٰ
پر امید ہے۔

۴۔ **امنیہ**: ۔ اور ہم نے تم سے   وَمَا اَرسَلنَا مِن قَبلِکَ مِن رَّسُولٍ
پہلے کوئی رسول اور نبی نہیں بھیجا   وَلَا نَبِیٍّ اِلَّا اِذَا تَمَنّٰی اَلقَی الشَّیطٰنُ
مگر اس کا یہ حال تھا۔ کہ جب وہ کوئی   فِی اُمنِیَّتِہٖ فَیَنسَخُ اللّٰہُ مَا
آرزو کرتا تو شیطان اس کی آرزو میں
وسوسہ ڈال دیتا۔ تو جو "وسوسہ"   یُلقِی الشَّیطٰنُ ثُمَّ یُحکِمُ
شیطان ڈالتا ہے۔ خدا اس کو دور   اللّٰہُ اٰیٰتِہٖ
کر دیتا ہے۔ پھر خدا اپنی آیتوں کو
مضبوط کر دیتا ہے۔

۵۔ اور کسی کام کے متعلق نہ کہنا کہ   وَلَا تَقُولَنَّ لِشَیءٍ اِنِّی فَاعِلٌ ذٰلِکَ
میں کل کر دوں گا۔ مگر انشاء اللہ   غَدًا اِلَّا اَن یَّشَآءَ اللّٰہُ (۱۸ / ۲۴)
کہہ کر (یعنی اگر خدا چاہے تو)۔

جب یہود نے حضور صلی اللہ علیہ وسلم سے روح، ذوالقرنین اور اصحاب کہف کے متعلق دریافت کیا۔ تو آپؐ انشاء اللہ کہنا بھول گئے۔ جس کے باعث آنحضرتؐ سے وحی رک گئی۔

نکاح زینبؓ

اور آپ   وَتُخفِی فِی نَفسِکَ مَا اللّٰہُ
اپنے دل   مُبدِیہِ وَتَخشَی النَّاسَ
میں وہ   وَاللّٰہُ اَحَقُّ اَن تَخشٰہُ

بات پوشیدہ کرتے تھے۔ جسے خدا ظاہر کرنیوالا تھا۔ اور آپ لوگوں سے ڈرتے تھے۔ حالانکہ خدا اس کا زیادہ مستحق ہے کہ اُس سے ڈریں (۳۳-۳۷)

فدیہ اور عذاب

منکرین عصمت اِس حدیث سے بھی استدلال کرتے ہیں۔ کہ جب رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے اُسیران بدر کو قتل کرنے کی بجائے فدیہ قبول کر لیا تھا۔ تو آنحضرتؐ نے فرمایا کہ

لَقَدْ عُرِضَ عَلَیَّ عَذَابُكُمْ اَدْنٰی مِنْ هٰذِهِ الشَّجَرَةِ لَوْ نَزَلَ عَذَابٌ مَا نَجَا مِنْهُ اِلَّا عُمَرُ

تمہارا عذاب سامنے کے اس پیڑ سے بھی قریب تر آچکا تھا اگر وہ نازل ہوتا۔ تو بجز عمرؓ کے کوئی محفوظ نہ رہتا۔

اِس لئے کہ حضرت عمرؓ نے اُن کی گردن زدنی کا مشورہ دیا تھا۔ آنحضرتؐ نے فدیہ قبول کر کے حضرت ابوبکرؓ کی ان پر رحم کرنے کی رائے کو ترجیح دی تھی۔

احسانِ عظیم

لِيَغْفِرَ لَكَ اللّٰهُ مَا تَقَدَّمَ مِنْ ذَنْبِكَ وَمَا تَاَخَّرَ (۴۸-۲)

تا کہ خدا تمہارے اگلے پچھلے گناہ معاف کر دے

معترضین کہتے ہیں۔ کہ اگر آپؐ معصوم اور بیگناہ تھے۔ تو کونسا گناہ معاف ہوا۔ اور آنحضرتؐ کس چیز کے احسان مند ہیں۔

رہائی کی پیشکش

اِس باب میں ذیل کی حدیث سے بھی سہارا لیا جاتا ہے کہ نبی علیہ السلام نے فرمایا۔ کہ اگر مجھے جیل سے رہائی کی پیشکش کی جاتی۔ جو یوسفؑ کو کی گئی تو میں منظور

کرلیا۔ جبکہ حضرت یوسفؑ کو رہائی کی دعوت ملی۔ تو وہ جیل سے باہر نہیں آئے۔ اور قاصد کو کہلا بھیجا۔ کہ اپنے مالک کے پاس جاؤ۔ اور ان سے دریافت کرو۔ کہ ہاتھ کاٹنے والی عورتوں کا کیا بنا۔ میرا مالک ان کے مکر سے آگاہ ہے۔

حضرت یوسفؑ نے جیل سے رہائی کی دعوت قبول نہیں فرمائی۔ تاوقتیکہ "مصری عورتوں" نے اپنے گناہ کا اور ان کی پاکدامنی کا علانیہ اعتراف نہیں کرلیا۔ اور جب تک آپ نے اس مشتبہ امر کا پورا اطمینان نہیں کرلیا۔

اس حدیث میں رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے یہ بتایا ہے۔ کہ اگر آپ کو جیل سے رہائی کی پیشکش ہوتی تو آپ قبول کرلیتے۔ اس سے آپؐ کا مقصد یوسفؑ کا اعزاز اور اظہار فضیلت ہے اور بس اور یہی وضاحت حدیث میں مذکور ہے۔ جیسا کہ آنحضرتؐ کے ارشاد گرامی سے واضح ہے۔ لَوْ لَبِثْتُ فِي السِّجْنِ مَا لَبِثَ يُوسُفُ ثُمَّ دُعِيتُ لَأَجَبْتُ الدَّاعِي

احسانِ مغفرت

آیت: لِيَغْفِرَ لَكَ اللّٰهُ مَا تَقَدَّمَ مِنْ ذَنْبِكَ وَمَا تَأَخَّرَ کے متعلق ہم بیان کرچکے ہیں۔ کہ انبیاء علیہم السلام کے گناہ وہی ہوتے ہیں۔ جو اُن سے بطور نسیان سرزد ہوتے ہیں۔ یا جو ارادہ خیر سے صادر ہوں مگر رضاء الٰہی کے موافق نہ پائے جائیں چنانچہ آیت مذکورہ میں بھی دو قسم کے گناہ مراد ہیں

قبول اور عذاب

آیت "لَوْلَا كِتَابٌ مِنَ اللّٰهِ سَبَقَ" الخ (۸ - ۶۸) میں خطاب عامۃ المسلمین سے ہے۔ نبی علیہ السلام مخاطب نہیں یہ واقعہ جنگ بدر کی غنیمت میں باہمی تنازعہ کے وقت پیش آیا تھا۔ تو وہی لوگ خطاوار ہونگے۔ جو آپ سے اختلاف کرتے تھے۔ اور اس امر کی وضاحت اس سے معلوم ہوتی

ہے۔ کہ:۔ یَسْئَلُوْنَكَ عَنِ الْاَنْفَالِ قُلِ الْاَنْفَالُ لِلّٰہِ وَالرَّسُوْلِ فَاتَّقُوا اللّٰہَ وَاَصْلِحُوْا ذَاتَ بَیْنِكُمْ (۸-۱)

پھر اسی سورت میں جو مالِ غنیمت کے متعلق نازل ہوئی ہے یہ آیت موجود ہے۔

یُجَادِلُوْنَكَ فِی الْحَقِّ بَعْدَ مَا تَبَیَّنَ ۔ (۸-۶)

وہ لوگ جو حق بات میں اس کے ظاہر ہونے کے بعد تم سے جھگڑنے لگے۔

اور وعید عذاب والی آیت جس سے معترض نے استدلال کیا ہے۔ کے قبل مذکور ہے۔ تُرِیْدُوْنَ عَرَضَ الدُّنْیَا وَاللّٰہُ یُرِیْدُ الْاٰخِرَۃَ (۸-۶۷) تم لوگ دنیا کے سامان کے طالب ہو اور خدا آخرت کی بھلائی چاہتا ہے

یہ سب نصوص قرآنی ہیں" جن سے عیاں ہے کہ اس آیت کے مخاطب عامۃ المسلمین ہیں۔ رسول اللہ صلعم نہیں" دیگر مالِ غنیمت کا فیصلہ اللہ تعالیٰ نے رسول اللہ کے سپرد فرمایا تھا۔

تحقیق حدیث

نزول عذاب والی روایت درست نہیں۔ اسلئے کہ اس میں عکرمہ بن عمار یمامی، متوفی سنہ ۱۵۹ھ راوی منفرد ہے۔ اور اس کا شمار ان راویوں میں ہوتا ہے۔ جن سے وضع حدیث یا خرابیٔ حافظہ، یا کثرت خطا ثابت ہے جس کے باعث اس سے روایت درست نہیں۔ بالفرض اگر روائت درست ہوتی۔ تو ہمارا اس میں بھی وہی جواب ہوتا جو ہم پہلے ذکر کر چکے ہیں۔ کہ نبی علیہ السلام کا فدیہ لینے میں بھی "خیر" ہی کا ارادہ تھا۔ مگر رضائے الٰہی کے موافق نہ ہوا۔

ابن ام مکتوم

سورہ "عبس" کی ابتدائی چند آیات کا واقعہ یہ ہے کہ نبی علیہ السلام کے پاس ایک قریشی رئیس بیٹھا تھا۔ آپ

کو اس کے مسلمان ہونے کی توقع تھی۔ اور خیال تھا۔ کہ اگر یہ مسلمان ہو گیا۔ تو اُس کے سبب لاتعداد لوگ مسلمان ہو جائیں گے۔ اور اسلام غالب آجائیگا۔

دیگر یہ کہ نابینا جو اسی موقعہ پر مسائل دین دریافت کر رہا ہے۔ وہ ہر وقت آپ کے ساتھ رہتا ہے۔ پھر کبھی پوچھ سکتا ہے۔ لہذا آنحضرت کو ایک "عظیم خیر" اور بڑی نیکی کے فوت ہونے کے خطرہ کی بنا پر" با دل نخواستہ" اس سے بے توجہی برتنی پڑی اور یہ بظاہر دین کی انتہائی توجہ۔ اور قرآن کی نشر و اشاعت میں پوری کوشش اور اللہ تعالےٰ کے تقرب کی انتہا ہے۔ اگر کوئی شخص فی زمانہ یہ کردار اختیار کرے۔ تو وہ عند اللہ ماجور ہو۔ اُس کے باوصف اللہ تعالیٰ نے آنحضرت کو قابل عتاب قرار دیا۔ کہ اللہ تعالیٰ کے ہاں یہی بہتر تھا۔ کہ آپ غایت درجہ نیک اور خدا ترس نابینا کی طرف توجہ فرماتے۔ اور یہی ہمارا مسلک ہے۔

اور اس واقعہ میں آپؐ سے سہو ہو گیا۔ جیسے آپ کو گاہے گاہے نماز میں سہو ہو جایا کرتا تھا۔ کہ "دو رکعت پر سلام پھیر دیا" اور باقی نہ پڑھی۔ اور ایک بار تین پر سلام پھیر دیا۔ ایک دفعہ" بلا تشہد" تیسری رکعت کے لیے اُٹھ کھڑے ہوئے۔ آپؐ نے یہ افعال ارادۃً بالکل اختیار نہیں کیے۔ اور نہ ہی کوئی انسان ایسا کر سکتا ہے جس میں نیکی کا ذرہ برابر بھی شائبہ ہو۔

حدیث "غرانیق" قطعی موضوع ہے۔ سند کے اعتبار سے صحیح نہیں اور اس کی تردید بے کار ہے۔ کیونکہ کسی "زندیق" کے لئے جھوٹ کی ایجاد کوئی مشکل کام نہیں۔

القائے شیطان

وَمَا اَرْسَلْنَا مِنْ قَبْلِكَ الخ آیت سے بھی الزام درست نہیں۔ اِسلئے کہ دلی آرزوئیں اور

نفسانی خواہشات درخورِ اعتنا نہیں۔ جیسا کہ نبی علیہ السلام نے اپنے عمِ محترم ابوطالب کے مشرف بہ اسلام ہونے کی آرزو کی تھی۔ مگر اللہ تعالیٰ کو منظور نہ تھا اور آیت میں مذکور "اُمنیہ" سے مراد یہی آرزوئیں اور تمنائیں مراد ہیں۔ معاذ اللہ کہ کوئی نبی معصیت کی تمنا کرے۔ بغیر کسی ظاہری تکلف کے آیت کا ظاہری مفہوم یہی ہے۔ اور ظاہر مفہوم کے خلاف کہنا کسی طور درست نہیں۔

مشیتِ ایزدی

آیت لا تقولنّ لشیءٍ انی فاعلٌ غدًا (۱۸-۲۴) میں بحث کرنے سے بھی آیت "واذکر ربّک اذا نسیت" (۱۸-۲۴) جب آپ کو نسیان ہو جائے۔ تو آپ اللہ کو یاد کریں ہم نے بے نیاز کر دیا ہے۔ کہ یہ بطور سہو و نسیان ہوا تھا لہٰذا آپ معتوب ہوئے۔

نکاحِ اُمّ المومنین

ہم آنحضرت صلعم کو آیت "وتخفی ما فی نفسک" (۲۲-۳۷) کی بنا پر اعتراض سے بالا سمجھتے ہیں۔ کیونکہ اس میں نہ تو معصیت ہے۔ اور نہ ہی خلاف رضاءِ الٰہی، صرف آنحضرتؐ کا ارادہ نکاح کا تھا۔ جس کا کرنا، نہ کرنا، اخفا اور اظہار سب آپ کے لئے مباح تھا۔ صرف آپؐ کو لوگوں سے اندیشہ تھا۔ کہ وہ باتیں بنائیں گے۔ اور بدگمانی کریں گے جس سے اُن کا دین تباہ ہو جائیگا۔

جیسے کہ نبی علیہ السلام نے دو انصاریوں سے مخاطب ہو کر کہا تھا۔ "یہ میری بیوی صفیہؓ ہیں" تو انہوں نے اس بات کو بہت محسوس کیا۔ اور اُن پر شاق گزری تو پھر نبی علیہ السلام نے فرمایا۔ کہ مجھے اندیشہ تھا۔ کہ مبادا شیطان تمہارے دلوں میں میرے متعلق بدگمانی پیدا کر دے۔

اسی بات کا آپ کو نکاحِ زینبؓ میں خطرہ تھا۔ کہ مبادا بدظنی

سے اپنا دین و ایمان تباہ و برباد کر بیٹھیں۔

غور کرو! یہ منکرین عصمت جو انبیاء سے عمداً ارتکابِ معاصی کے قائل ہیں۔ وہی باتیں کرتے ہیں۔ جن سے رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کو لوگوں کے دین کی تباہی کا اندیشہ تھا۔ لہٰذا ان کا دین تباہ ہو گیا۔ اور وہ گمراہ ہو گئے۔

منشاء الٰہی اور اللہ تعالیٰ کا منشاء یہ تھا کہ آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم کے دل میں جو بات مضمر ہے۔ وہ ظاہر فرما دیں۔ اس لیے کہ یہ سعادت ام المومنین حضرت زینبؓ کے لیے اللہ تعالیٰ کے ہاں مقدر ہو چکی تھی۔

آنحضرتؐ کی سیرت قرآن کی ترجمان ہے

وہ خواہشاتِ نفسانی سے باتیں نہیں بناتا۔ اُس کا ارشاد صرف وحی الٰہی ہوتا ہے۔ جو اُس پر نازل کی جاتی ہے۔

اور نہ خواہش نفس سے منہ سے	وَمَا يَنْطِقُ عَنِ الْهَوٰى إِنْ هُوَ إِلَّا
بات نکالتے ہیں۔ یہ بحکم خدا	وَحْيٌ يُّوحٰى (۵۳ – ۳،۴)
ہے جو بھیجا جاتا ہے۔	
تمہارے پروردگار کی قسم یہ	فَلَا وَرَبِّكَ لَا يُؤْمِنُوْنَ حَتّٰى يُحَكِّمُوْكَ
لوگ جب تک اپنے تنازعات	فِيْمَا شَجَرَ بَيْنَهُمْ ثُمَّ لَا يَجِدُوْا
میں تمہیں منصف نہ بنائیں اور	فِيْٓ اَنْفُسِهِمْ حَرَجًا مِّمَّا قَضَيْتَ وَ
جو فیصلہ تم کرو۔ اس سے اپنے	يُسَلِّمُوْا تَسْلِيْمًا (۴ – ۶۵)

دل میں تنگی محسوس نہ کریں ۔ بلکہ اس کو خوشی سے مان لیں تب تک مومن نہیں بنیں گے ۔

تم کو پیغمبر خدا کی پیروی بہتر ہے لَقَدْ كَانَ لَكُمْ فِي رَسُولِ اللّٰہِ اُسْوَةٌ
اس شخص کو جسے خدا، روز قیامت حَسَنَةٌ لِّمَنْ كَانَ يَرْجُو اللّٰہَ وَالْيَوْمَ
کی امید ہے ۔ اور وہ خدا کا کثرت الْاٰخِرَ وَذَكَرَ اللّٰہَ كَثِيرًا (۲۱-۳۳)
سے ذکر کرتا ہے ۔

آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا قَالَ رَسُولُ اللّٰہِ صلعم اِنِّي لَاَتْقَاكُمْ
کہ میں تم سب سے زیادہ خدا لِلّٰہِ وَاَعْلَمُكُمْ بِمَا آتِي اَذَرُ
ترس ہوں اور کسی کام کے کرنے اور نہ کرنے کو تم سب سے خوب جانتا ہوں ۔

اگر کوئی اعتراض کرے ۔ کہ تم ان درج بالا آیات واحادیث سے بکثرت استدلال کرتے ہو ۔ اور انہی کی روشنی میں بات کرتے ہو ۔ کہ آپؐ نے جو کچھ فرمایا ہے ۔ وہ اللہ تعالیٰ کی وحی ہی ہے ۔ گفتۂ او گفتۂ اللہ بود ۔

اور جو فعل بھی کیا ہے ۔ وہ بھی اللہ تعالیٰ کے اذن و رضا سے کیا ہے تو اس کا کیا جواب دو گے ؟ کہ آپؐ سے جو نمازمیں سہو ہو جاتا تھا ۔ کہ دو اور تین رکعتوں پر سلام پھیر دیتے ۔ اور دوسری رکعت پر بیٹھنے کی بجائے اٹھ کھڑے ہوتے ۔ اور ظہر کی پانچ رکعتیں پڑھ جاتے ۔

نیز اس کا کیا جواب ہوگا ۔ کہ آپؐ نے فرمایا ۔ کہ آنحضرتؐ بظاہر ایسے شخص کے حق میں فیصلہ فرما دیتے ۔ جسے وہ لینا جائز نہیں ہوتی ۔ کیونکہ وہ جانتا ہے ۔ کہ دراصل صحیح فیصلہ اس کے خلاف ہے ۔ . . . کہو کیا یہ سارے امور اللہ تعالیٰ کی وحی و رضا سے آنحضرتؐ نے انجام دیئے یا کوئی اور

جواب ہوگا؟ — کیا مدعی اور مدعا علیہ کے لئے ایسے فیصلے سے اظہار خوشنودی واجب ہے۔ یا نہیں؟ جبکہ ان کو علم بھی ہو کہ آنحضرت کا فیصلہ "خلاف توقع" ہے۔

قول فیصل

یہ سب اُمور جو یہاں مذکور ہیں۔ سب کے سب آپ نے اللہ تعالٰی کی وحی سے ہی انجام دیئے ہیں۔ جس شخص کو اپنی نماز پوری ہونے میں کوئی شک نہیں۔ اللہ تعالٰی نے اُسے سلام پھیرنے کا حکم دیا ہے۔ اور جب بعدازیں اسے "سہو" کا علم ہو تو شریعت نے تکمیل نماز اور "سجدۂ سہو" لازم قرار دیا ہے۔

اِس امر کی دلیل یہ ہے۔ کہ اگر کوئی دیدہ دانستہ بطور تمسخر ایک ہی رکعت پر تشہد میں بیٹھ جائے یا تیسری رکعت پر سلام پھیر دے تو اس کی نماز باطل ہو جائے گی۔ اور وہ فاسق و نافرمان ہوگا۔ اس لیے کہ اُس نے اللہ تعالیٰ کے حکم کی خلاف ورزی کی ہے۔

فیصلہ مُوافق بیان

اِسی طرح اللہ تعالیٰ نے آنحضرتؐ اور جمیع مسلمانوں کو بزعم خویش سچی شہادتوں، مدعا علیہ کی قسم اور معترف کے اقرار کے موافق فیصلہ صادر کرنے کا حکم دیا ہے۔ خواہ وہ حلف، اعتراف اور شہادت دیدہ دانستہ جھوٹی ہوں بشرطیکہ ہم ان کے جھوٹ سے "لا علم" ہوں۔

ایسی ہی شہادتوں کے پیش نظر اللہ تعالیٰ نے "خوں ریزی" واجب قرار دے دی ہے۔ اگر ہمیں "باطن" اور حقیقت حال کا علم ہوتا۔ تو وہ

خون حرام ہوتا یہی حکم مال، نکاح، عتاق اور طلاق وغیرہ کا ہے۔

اور اس کی دلیل یہ ہے۔ کہ اگر حاکم کے پاس ایسی شہادت گذری۔ جو اس کے نزدیک قابل اعتبار تھی۔ پھر اس کے خلاف فیصلہ صادر کیا۔ اور اسی طرح جس مدعیٰ علیہ کے خلاف کوئی شہادت میسر نہیں۔ اور حاکم نے مدعیٰ علیہ کو حلف اٹھانے کا حکم دیا۔ اور پھر بھی اس کے مطابق فیصلہ نہیں کیا۔ تو ان دونوں صورتوں میں حاکم بالاتفاق، فاسق، اور حکم خداوندی کی خلاف ورزی کا مرتکب اور گنہ گار ہوگا۔ اگرچہ یہ فیصلہ غیر شعوری طور پر درست واقع ہو۔

مدعی اور مدعا علیہ دونوں کو شہادت اور قسم کے مطابق فیصلہ پر رضا مند ہونا واجب ہے۔ اور حقوق کے لین دین میں اپنے صحیح علم اور اصل واقعہ کیطرف رجوع کرنا ضروری ہے۔

مایوسی کے بعد

معترضین نے اس سلسلہ میں یہ آیت بھی نقل کی ہے۔

حَتّٰٓی اِذَا اسْتَیْئَسَ الرُّسُلُ فَظَنُّوْٓا
اَنَّھُمْ قَدْ کُذِبُوْا جَآءَھُمْ نَصْرُنَا

یہانتک کہ جب پیغمبر ناامید ہو گئے۔ اور انہوں نے خیال کیا کہ ان سے جو وعدہ کیا گیا تھا وہ جھوٹا تھا۔ تو ہماری مدد آ پہنچی (۱۲ - ۱۱۰)

"کُذِبوا" میں ذال مخفف ہے۔ جہلا کے خیال کے مطابق اس آیت کا مفہوم بالکل نہیں۔ بلکہ اس کے معنی ہیں کہ انبیا سے جس قوم نے نصرت و مدد کا وعدہ کیا تھا، انہیں خیال آیا کہ وہ بدعہدی کریں گے۔

کسی احمق اور بیوقوف سے بھی یہ باور کرنا محال ہے کہ اللہ تعالیٰ جھٹلاتا اور خلاف وعدہ کرتا ہے۔ چہ جائیکہ انبیاء، ایسا تصور کریں۔ جو کائنات کے برگزیدہ اور علم و عرفان میں سب سے اکمل و اعلیٰ ہیں۔ اور جس شخص نے یہ بات کسی نبی کی طرف منسوب کی تو اس نے نبی کی طرف کفر منسوب کیا۔ اور انبیاء کی طرف کفر کی نسبت جائز سمجھنے والا، خود مرتد کافر ہے۔

ہمارا بیان کردہ مفہوم آیت کا ظاہری مفہوم ہے۔ معاذاللہ آیت سے ہرگز یہ مفہوم نہیں ہوتا۔ کہ اللہ تعالیٰ نے انہیں جھوٹ کہا تھا۔

منکرین عصمت نے اس آیت سے بھی استدلال کیا ہے۔

پس اگر آپ کو اس قرآن میں شک فَاِنْ كُنْتَ فِي شَكٍّ مِّمَّا اَنْزَلْنَا اِلَيْكَ ہے جو ہم نے آپ پر نازل کیا ہے۔ (۱۰ — ۹۴)

ہم نے یہ اعتراض صرف اہل کتاب ہی سے سنا ہے کسی مسلمان کو یہ اعتراض کرتے نہیں پایا۔ کیونکہ محال ہے کہ کوئی مسلمان رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کے متعلق یہ خیال کرے کہ آپ کو "وحی" میں شک تھا۔

اس آیت کے متعلق ہمارا ایک مشہور رسالہ ہے ——— اس اعتراض کا مختصر جواب یہ ہے۔ کہ آیت میں "ان" بمعنی "ما" نافیہ ہے۔ یعنی آنحضرت کو کوئی شک نہ تھا۔ پھر اللہ تعالیٰ نے آپ کو اہل کتاب سے اقرار و اذعان کی غرض سے دریافت کرنے کا حکم فرمایا۔ کہ وہ خوب جانتے ہیں کہ آپ وہی نبی مرسل ہیں۔ جن کا ذکر خیر" تورات و انجیل میں موجود ہے۔

ہم نے معترضین کے تمام اعتراضات اور ملمع کاری کی ایک ایک کرکے قلعی کھول

دی ہے۔ اور ثابت کر دیا ہے۔ کہ یہ سب دلائل وبراہین ہمارے مسلک کے مطابق ہیں۔ منکرین عصمت کی تائید وتوثیق نہیں کرتے۔ وباللہ التوفیق

دلائل عصمت

اب ہم انشاء اللہ تعالیٰ کی مدد ونصرت سے اپنے مسلک کی تائید وتوثیق اور مخالفین کے خیال کے ابطال وتردید میں چند دلائل عصمت پیش کرتے ہیں۔ چنانچہ ارشاد باری تعالیٰ ہے۔

کبھی نہیں ہو سکتا کہ نبی خیانت کریں اور خیانت کرنے والوں کو قیامت کے دن خیانت کی چیز حاضر کرنی ہوگی۔	مَا كَانَ لِنَبِيٍّ أَنْ يَّغُلَّ وَمَنْ يَّغْلُلْ يَأْتِ بِمَا غَلَّ يَوْمَ الْقِيَامَةِ (۳ - ۱۶)
کسی آدمی کو زیب نہیں دیتا کہ خدا تو اُسے کتاب، حکومت اور نبوت عطا فرمائے۔ اور وہ لوگوں سے کہے کہ خدا کو چھوڑ کر میرے بندے بن جاؤ۔	مَا كَانَ لِبَشَرٍ أَنْ يُّؤْتِيَهُ اللّٰهُ الْكِتَابَ وَالْحُكْمَ وَالنُّبُوَّةَ ثُمَّ يَقُوْلَ لِلنَّاسِ كُوْنُوْا عِبَادًا لِّيْ مِنْ دُوْنِ اللّٰهِ (۳ - ۷۹)

اللہ تعالیٰ نے انبیاء سے خیانت، کفر اور غرور وتکبر کو دور فرما دیا ہے اور تمام اُمت کا بالاتفاق رائے اجماع ہے۔ کہ خیانت وغلول کا حکم بھی دیگر گناہوں جیسا ہے۔ لہٰذا انبیاء علیہم السّلام کو خطاءً عمداً کا مرتکب سمجھنا ایسا ہی ہے جیسا کوئی انہیں غلول وخیانت سے منسوب کرے۔ اور جس نے اُن سے پاک سمجھا گویا اُس نے انبیاء کو ہر قسم کے گناہوں سے بالا سمجھا۔

انبیاء کا غلول وخیانت سے محفوظ رہنا قرآن سے ثابت ہو چکا ہے

لہٰذا ان سے بالارادہ گناہ کی نفی بھی ثابت ہوگئی۔ اُمت کا اجماع ہے کہ باقی گناہ بھی غلول کا حکم رکھتے ہیں۔

جو لوگ بُرے کام کرتے ہیں کیا وہ یہ خیال کرتے ہیں کہ ہم ان کو اُن لوگوں جیسا کردینگے جو ایمان لائے۔ اور عمل نیک کرتے رہے۔ اور ان کی زندگی اور موت یکساں ہوگی۔ یہ جو دعویٰ کرتے ہیں بُرے ہیں۔

اَمْ حَسِبَ الَّذِیْنَ اجْتَرَحُوا السَّیِّاٰتِ اَنْ نَّجْعَلَهُمْ كَالَّذِیْنَ اٰمَنُوْا وَعَمِلُوا الصّٰلِحٰتِ سَوَاءً مَّحْیَاهُمْ وَمَمَاتُهُمْ سَاءَ مَا یَحْكُمُوْنَ

(۴۵ - ۲۱)

جو معترض انبیاء پر سیئات کا ارتکاب ممکن سمجھتا ہے۔ یہ امر دو حال سے خالی نہیں۔ اسے ان دو میں سے ایک ضرور تسلیم کرنا ہوگا۔

۱۔ کہ بعض لوگ ایسے بھی ہیں جنہوں نے نہ کبھی معصیت کی۔ اور نہ گناہ کا ارتکاب کیا۔ بتاؤ ایسے نیک سیرت کون لوگ ہیں کہ "بدکار" ان جیسے نہیں ہوسکتے۔ جب کائنات میں ایسے لوگ نایاب ہیں۔ تو لامحالہ قرآن کا یہ ارشاد مہمل اور بے فائدہ ہوگا۔ جو کہ صریح کفر ہے۔

۲۔ یا یہ تسلیم کرنا پڑیگا۔ کہ اس ارشاد کا مصداق ملائکہ ہیں۔ مگر اس دعویٰ کی تردید خود اس آیت میں موجود ہے۔ (سَوَاءً مَّحْیَاهُمْ وَمَمَاتُهُمْ) کہ ان کا مرنا جینا یکساں ہے۔

ملائکہ کی موت

ملائکہ کی موت کے متعلق اجماع نہ کوئی صریح نص موجود ہے۔ بلکہ بدلائل یہ ثابت ہے۔ کہ ملائکہ

کبھی فوت نہ ہوں گے۔ اسی طرح حوریں بھی
موت نام ہے۔ رُوح کے جسم عنصری سے جدا ہونے کا۔ اور ملائکہ کی
پیدائش بالاتفاق نورِ محض سے ہے۔ تو جب اُن کی ماہیّت میں کوئی ایسی چیز شامل
ہی نہیں جو ایک دُوسری سے جدا ہو۔ اور موت کا باعث ہو تو ان کی موت کا
سوال ہی پیدا نہیں ہوتا۔

اگر کوئی شخص آیت "کُلُّ نَفْسٍ ذَائِقَۃُ الْمَوْتِ" ہر نفس پر
موت طاری ہوگی" کی بنا پر ملائکہ پر موت کا قائل ہو تو اگر وہ آیت کو اس
کے عموم پر محمول کرتا ہے۔ تو اس سے حوروں پر بھی موت کا طاری ہونا لازم
آتا ہے۔ جو جنت کے بھی فانی ہونے پر منتج ہوتا ہے۔ حالانکہ اللہ تعالیٰ نے
جنت کو زوال و فنا سے محفوظ و مامون رکھا ہے۔ اِنَّ الدَّارَ الْآخِرَۃَ لَھِیَ
الْحَیَوَانُ، کو دارِ آخرت دارِ جاودانی ہے۔

معلوم ہوا کہ "کُلُّ نَفْسٍ ذَائِقَۃُ الْمَوْتِ" سے مراد جنت و مافیہا کے
علاوہ ذی رُوح کائنات ہے جس کے رُوح و جسم کا جدا ہونا متصور ہو سکتا ہے
نیز آیت زیرِ بحث کو عموم پر محمول کرنے سے حسبِ ذیل حدیث مانع
ہے۔ کہ آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا۔ کہ ہر شخص نے گناہ کا ارتکاب
کیا ہے۔ یا وہ قریب تھا کہ گناہ کرے۔ بجز حضرت یحییٰ علیہ السلام کے۔
یا بعض لوگ ایسے بھی موجود ہیں۔ جن سے کبھی گناہ سرزد نہیں ہوا۔
اور حسبِ ارشادِ الٰہی" بدکار" اُن کے مساوی نہیں ہوتے۔ اِس عقیدے
کی روشنی میں انبیاء، گناہ کے مرتکب ٹھہرے۔ اور دیگر لوگ گناہ سے

محفوظ ثابت ہوئے۔ بنابریں یہ لازم آئیگا۔ کہ کوئی اُمتی انبیاء سے افضل ہے۔ جو کہ صریح کفر ہے۔ ہمارے خیال میں کسی بھی مسلمان یا کتابی کو یہ الفاظ زیب نہیں دیتے۔ البتہ باقلانی کے متعلق اُس کے شاگرد ابوجعفر سمنانی سے منقول ہے۔ کہ اُمت محمدیہ میں آنحضرت کی بعثت سے وفات تک کے درمیانی عرصہ میں آپ سے کوئی افضل ہو سکتا ہے۔ یہ خالص شرک اور نبوت پہ بھرپور وار ہے اور ہمیں سخت ناگوار ہے۔

متصوفہ

ہم نے "متصوفین" کے ایک گروہ کے متعلق سنا تھا۔ کہ اُن کا عقیدہ ہے۔ کہ ولی، نبی سے افضل ہوتا ہے۔ ہم یقین نہیں کرتے تھے۔ کہ ایک کلمہ گو ایسا کہہ سکتا ہے۔ تاوقتیکہ مذکورہ بالا عقیدہ ہم نے اپنی آنکھوں سے ملاحظہ کیا۔

اگر یہ بدعقیدہ اور گمراہ شخص "افضل" اور "فضیلت نبوت" کے مفہوم سے آشنا ہوتا۔ تو یہ بکواس نہ بکتا۔ دراصل یہ نبی علیہ السلام کی تکذیب و تضحیک ہے۔ اِس لئے کہ آنحضرت نے فرمایا۔ کہ میں تم سب سے زیادہ اللہ تعالیٰ سے ڈرتا ہوں۔ اور تمہارے جیسا نہیں ہوں۔

اور بہ نص صریح ثابت ہے۔ کہ بعض لوگوں نے گناہ کا ارتکاب بالکل نہیں کیا۔ اور گناہ گار اللہ تعالیٰ کے ہاں ان کے مساوی نہیں ہوں گے لہٰذا بغیر کسی اختلاف کے یہ ثابت ہو گیا۔ کہ انبیاء ہی اِس فضیلت و منقبت کے اہل ہیں۔ اِس لئے کہ انبیاء و رسل اللہ تعالیٰ کی پسندیدہ اور برگزیدہ مخلوق ہے۔ اَللّٰہُ یَصْطَفِیْ مِنَ الْمَلٰٓئِکَةِ رُسُلًا وَّمِنَ النَّاسِ

بلوغت اور ہلاکت

اگر کوئی یہ کہے کہ ایک لڑکا حد بلوغت کو پہنچتے ہی مسلمان ہو گیا۔ اور اس نے متعدد دفعہ ذکر الٰہی کیا۔ پھر فوراً فوت ہو گیا۔

یا ایک کافر مشرف بہ اسلام ہوا پھر وہ فوراً جہاد میں شریک ہوا اور شہید ہو گیا۔ بتاؤ ان دونوں کے متعلق تمہارا کیا خیال ہے۔

سنئے! کافر جو مشرف بہ اسلام ہوا۔ اور پھر جہاد میں شریک ہو گیا۔ اس نے تو کفر کی حالت میں زمین و آسمان سے کہیں بڑے گناہ کا ارتکاب کیا تھا۔ گو وہ اسلام کے باعث معاف ہو چکے ہیں۔ لہٰذا اس کا شمار گناہگاروں میں ہو گا۔

اور حد بلوغت کو پہونچتے ہی مسلمان ہونا۔ اور پھر متعدد بار ذکر الٰہی میں مشغول رہ کر وفات پانا۔ یہ طبعی طور عین ممکن ہے۔ مگر حسب ذیل آیت کے منافی ہے

کیا گناہگاروں کا خیال ہے کہ ہم انہیں مومنوں اور نیک اعمال جیسے کر دینگے۔ ان کا مرنا جینا دونوں یکساں ہے۔

أَمْ حَسِبَ الَّذِيْنَ اجْتَرَحُوا السَّيِّاٰتِ أَنْ نَّجْعَلَهُمْ كَالَّذِيْنَ اٰمَنُوْا وَعَمِلُوا الصّٰلِحٰتِ سَوَاءً مَّحْيَاهُمْ وَمَمَاتُهُمْ (۲۵ - ۲۱)

اللہ تعالیٰ نے قطعی فیصلہ صادر فرما دیا ہے۔ جس کے انکار کی بجز کافر کسی کو گنجائش نہیں۔ کہ گناہگار اور بے گناہ ایک ایسے نہیں ہوتے۔

فضائل صحابہ

ہم پورے وثوق سے کہتے ہیں۔ کہ صحابہ جو انبیاء کے بعد افضل ترین لوگ ہیں۔ ان سے بھی بلا استثنا کوئی نہ کوئی گناہ ضرور سرزد ہوا ہے۔ بریں صورت یہ لازم آئے گا۔ کہ

حد بلوغت کو پہنچتے ہی مسلمان ہونے اور متعدد دفعہ ذکر الٰہی کے بعد فوت ہونے والا صحابہ کرام سے افضل ہوگا۔ اور یہ بات رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کے درج ذیل ارشاد گرامی کے صریح خلاف ہے۔ کہ اگر کوئی شخص احد پہاڑ کے برابر سونا خرچ کرے۔ تو وہ بھی صحابی کے مد یا نصف مد جو کے صدقہ کے برابر اجر کو نہیں پہنچ سکتا۔ اگر ہمارا یہ بیان درست ہے۔ تو خدا اور رسول کا فرمان سب سے زیادہ لائق اتباع ہے۔ خصوصاً رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کے اس فرمان کے ہوتے ہوئے کہ بجز یحییٰ علیہ السلام ہر کسی نے گناہ کا ارتکاب کیا ہے۔ یا قریب تھا۔ کہ ارتکاب کرتا۔

بنا بریں ہم قطعی طور پر فیصلہ دیتے ہیں کہ محال ہے کہ کوئی شخص حد بلوغت کو پہنچ جائے اور گناہ کا ارتکاب نہ کیا ہو۔

انبیاء معصوم ہوتے ہیں۔

انبیاء سے کوئی گناہ سرزد نہیں ہوتا۔ ابن ابی سرح کے واقعہ میں آنحضرت سے ایک انصاری نے کہا تھا۔ ھلا اومأت الیّ، آپ نے مجھے اشارہ کیوں نہ فرمایا۔ تو نبی علیہ السلام نے فرمایا۔ کسی نبی کو یہ سزاوار نہیں۔ کہ اس کی آنکھ خیانت کرے۔

پس نبی علیہ السلام نے جملہ انبیاء سے دزدیدہ نگاہی کو مستبعد سمجھا ہے۔ حالانکہ دزدیدہ نگاہی نہایت خفیف گناہ اور ایک معمولی سا۔ ظاہر کا باطن کے خلاف ہونا ہے جب ایسا خفیف سا گناہ نبی کو سزاوار نہیں تو دیگر گناہوں سے نبی بالا ولیٰ پاک ہوگا۔

اقتدائے انبیاء

ہم سب مسلمان، انبیاء کے جملہ گفتار و کردار میں ان کی اتباع و اقتداء کے مامور ہیں۔ اللہ تعالیٰ
نے فرمایا ہے۔ کہ لقد کان لکم فی رسول اللہ
تمہارے لیے رسولؐ اُسوۃ حسنۃ اولئک الذین
کی سیرت میں بہترین نمونہ ھدی اللہ فبھدٰھم اقتدہ
ہے۔ یہ ہدایت یافتہ ہیں۔ انہی کی "ہدایت" کی پیروی کرو۔

لہٰذا واضح ہوگیا۔ کہ اگر "بفرض محال" کسی نبی سے ارادۃً کوئی صغیرہ کبیرہ گناہ صادر ہونا ممکن ہوتا۔ تو گویا اللہ تعالیٰ نے ہمیں معاصی کی ترغیب و تحریص کی اور گناہ کی پیشکش کی۔ انبیاء سے ارادۃً گناہ سرزد ہونے کا اعتقاد صریح کفر ہے۔ کیونکہ انبیاء کے جملہ "ارادی افعال" سرتاسر خیر اور حق ہی ہوتے ہیں۔

ذوالخویصرہ

ذوالخویصرہ نے جب نبی علیہ السلام کو کہا۔ اے محمدؐ! عدل و انصاف سے کام لیجئے۔ کیونکہ اس تقسیم سے اللہ کی رضا جوئی مقصود معلوم نہیں ہوتی۔ تو آپؐ نے سخت تنبیہ و سرزنش کی۔ کہ میں خائن نہیں۔ امین ہوں۔ اور ارادۃً کوئی گناہ نہیں کرسکتا ہوں فرمایا، مجھے افسوس میں عدل نہ کروں گا تو اور کون کریگا۔ اللہ تعالیٰ نے مجھے امین اور قابل اعتماد سمجھا ہے اور تم مجھ پر اعتماد نہیں کر رہے۔

اسی طرح جب حضرت ام سلمہؓ سے کسی نے مسئلہ دریافت کیا۔ کہ حالت روزہ میں بیوی کا بوسہ لینا جائز ہے؟ آپ نے آنحضرتؐ سے دریافت

کیا۔ تو آپ نے فرمایا۔ کیا تو نے اسے نہیں بتایا۔ کہ اللہ کے رسول نے خود ایسا کیا ہے۔ یعنی نبی نے جو فعل کیا ہے وہ گناہ نہیں۔ کہ نبی گناہ سے بالاتر ہے

نیز دوران گفتگو ایک شخص نے آنحضرت ؐ سے کہا کہ آپ ہمارے مانند نہیں ہیں۔ آپ کے تو تمام اگلے پچھلے گناہ معاف ہو چکے ہیں تو آپ ؐ کو یہ بات نہایت ناگوار گزری۔ اور اس سے سخت ناراض ہو گئے۔ کیونکہ اس نے آپ کیطرف معمولی سے گناہ کی نسبت کی تھی۔ اور آپ نے فرمایا۔ بخدا! تم سے زیادہ اللہ تعالیٰ کو جانتا ہوں اور سب سے زیادہ اس سے ڈرتا ہوں (او کما قال)

سہو

اگر کوئی معترض کہے۔ کہ آپ اسی دلیل کی رو سے کہ "مسلمان انبیاء کی اقتداء پر مامور ہیں"۔ انبیاء سے سہو ونسیان کو کیوں بعید نہیں سمجھتے۔

تو بات یہ ہے۔ کہ ثابت شدہ مسئلہ کا انکار، غیر ثابت شدہ مسئلہ کی اجازت دونوں میں یکساں جرم ہے۔ لہٰذا سہو انبیاء سے یقیناً ثابت ہے۔ اور اللہ تعالیٰ کا ہمیں ان کی پیروی کا حکم دینا سہو کے واقع ہونے سے مانع نہیں۔ اس لئے کہ سہو کی اتباع سہو ہی کی حالت میں ممکن ہے۔

نیز یہ محال ہے۔ کہ ہمیں سہو کی پیشکش کی جائے۔ یا ہم اس کے مکلف ہوں۔ کیونکہ سہواً اگر ہم نے بہ ارادہ کیا تو وہ سہو نہ رہا۔ ۔ ۔ ۔ اور سہو سے ہمیں منع کرنا بھی ناممکن ہے۔ اس لئے کہ سہو سے رکنا ہماری

فطرت و وسعت سے بالا ہے۔ اور اللہ تعالیٰ کسی کو طاقت سے زیادہ تکلیف نہیں دیتا۔ لَا یُکَلِّفُ اللّٰہُ نَفْسًا اِلَّا وُسْعَھَا

دیگر ہم سہو کی حالت میں انبیاء کے سہوی اقتداء پر مامور ہیں۔ نیز اللہ تعالیٰ انبیاء کو سہو پر ثابت نہیں رکھتا۔ بلکہ فوراً آگاہ کر دیتا ہے۔ اگر ایسا نہ ہوتا۔ تو مسائل دین واضح نہ ہوتے۔ اللہ تعالیٰ کی تکذیب لازم آتی۔ اللہ تعالیٰ فرماتا ہے۔ وَفِیْہِ تِبْیَانٌ لِّکُلِّ شَیْءٍ قرآن میں ہر شئے کا واضح بیان موجود ہے۔" اَلْیَوْمَ اَکْمَلْتُ لَکُمْ دِیْنَکُمْ" آج ہم نے تمہارا دین مکمل کر دیا۔" وَفَصَّلَ لَکُمْ مَّا حَرَّمَ عَلَیْکُمْ" اور محرمات کی تفصیل بیان کر دی ہے۔

لہذا جو لوگ انبیاء کی طرف کسی قسم کے صغیرہ یا کبیرہ گناہ کی نسبت کے قائل تھے۔ اُن کا دعویٰ باطل ہو گیا۔ اور تمام ملمع کاریوں کی قلعی کھل گئی۔ اور بیجا اعتراض کی بنا پر ذوالخویصرہ مذکور کے حامی اور ہم نوا ہو گئے۔

توبہ

اگر انبیاء سے کسی بھی معصیت کا سرزد ہونا ممکن ہوتا تو گویا ہمارے لیئے معصیت مباح ہوتی۔ اِسلئے کہ ہم ان کی اتباع واقتداء پر مامور ہیں۔ بنا بریں "معاذ اللہ" شاید ہمارا دین بھی ضلالت کا پلندا اور کفر کا گڑھا ہو۔ اور آنحضرتؐ کے جملہ افعال معصیت اور گناہ ہوں۔

ایک دفعہ میں نے ایسے شخص سے کہا۔ جو انبیاء سے بارادھنائر

کے سرزد ہونے کا قائل تھا۔ کیا اجنبی عورت کی چٹکی لینا۔ اور منہ چومنا صغیرہ گناہ ہے۔ اس نے یہ تسلیم کیا۔ تو میں نے کہا عمداً اجنبی عورت کا بوسہ لینا۔ کیا نبی کے لئے روا ہے؟ تو اس نے فوراً انکار کیا۔ اپنے عقیدۂ بد سے باز آیا۔ الحمد للہ رب العالمین

کامل انعام

ارشاد الٰہی ہے۔ لِيَغْفِرَ لَكَ اللّٰهُ مَا
تَقَدَّمَ مِنْ ذَنْبِكَ وَمَا تَأَخَّرَ
تاکہ اللہ تعالیٰ وَيُتِمَّ نِعْمَتَهٗ عَلَيْكَ وَيَهْدِيَكَ
آپ کے اگلے صِرَاطًا مُّسْتَقِيمًا۔
پچھلے گناہ معاف کر دے اور نعمت کی تکمیل کرے۔ اور سیدھا راستہ دکھلائے

جس برگزیدہ ہستی پر اللہ تعالیٰ کامل انعام فرمائے۔ اور اس کو راہِ راست پر چلائے۔ تو ناممکن ہے۔ کہ وہ اس کی معصیت کا مرتکب ہو۔ اس لئے کہ وہ خدا کا نافرمان ہو تو اس کا انعام کامل نہ ہوگا۔ کہ اللہ تعالیٰ نے اس کو بعض امورِ معصیت میں جو اس سے سرزد ہوئے ہیں۔ بے یار و مددگار چھوڑ دیا ہے۔ اللہ تعالیٰ نے فرمایا ہے۔ کہ

ہم نے (اے محمدؐ) تم کو حق ظاہر إِنَّآ أَرْسَلْنٰكَ شَاهِدًا وَّمُبَشِّرًا
کرنیوالا، اور خوشخبری سنانیوالا وَّنَذِيرًا لِّتُؤْمِنُوْا بِاللّٰهِ وَ
اور خوف دلانیوالا بنا کر بھیجا۔ تاکہ رَسُوْلِهٖ وَتُعَزِّرُوْهُ وَتُوَقِّرُوْهُ
(مسلمانو) تم خدا پر اور اس کے پیغمبر پر ایمان لاؤ۔ اور اس کی مدد کرو اور

اُسے بزرگ سمجھو۔

کہو کیا تم خدا اور اس کی   قُلْ أَبِاللّٰهِ وَآيَاتِهٖ وَرَسُولِهٖ
آیتوں اور اس کے رسول   كُنْتُمْ تَسْتَهْزِءُونَ لَا تَعْتَذِرُوا
سے ہنسی کرتے تھے۔ بہانے   قَدْ كَفَرْتُمْ بَعْدَ إِيمَانِكُمْ
مت بناؤ۔ تم ایمان لانے کے بعد کافر ہو چکے ہو۔

لہٰذا جس شخص نے انبیاء کو جھوٹا اور زانی وغیرہ سمجھا۔ اُس نے انبیاء کی کوئی توقیر و تعظیم نہیں کی۔ بلکہ انتہائی تذلیل و تضحیک کی۔ واللہ وہ بد ترین مجرم اللہ، رسول اور اس کے دین کا مذاق اڑانیوالا ہے۔

مضحکہ خیز

کاش مجھے معلوم ہوتا۔ کہ منکرین عصمت کو انبیاء کے متعلق تبلیغ رسالت میں جھوٹ نہ بولنے سے کیونکر اطمینان ہوا۔ خدانخواستہ انہوں نے اللہ تعالےٰ کے نام پر جھوٹ کی تبلیغ کی ہو۔ لہٰذا ممکن ہے انبیاء کے وہ افعال و اقوال جن کو ہم "اسوۂ حسنہ" سمجھتے ہیں۔ وہ دراصل بے دینی۔ زندقہ، اور اللہ تعالےٰ کی معصیت ہوں۔

ہم نے رافضیوں اور منکرین عصمت سے بڑھ کر کسی کو دین کا دشمن اور اسلام کی بیخ کنی میں کوشاں نہیں پایا۔ یہ دونوں ملعون فرقے دین میں تحریف کے قائل ہیں۔

منکرین عصمت نے انبیاء پر معاصی کے اطلاق کے باوصف اس بات کی بھی تصریح کی ہے۔ کہ اللہ تعالیٰ نے ہمیں اپنے ظن غالب

کا تابع کیا ہے۔ اور اس کے مطابق عبادت کا حکم دیا ہے۔ اور انسان کا ظنِّ غالب فرمانِ خدا ہوتا ہے۔ گو وہ متضاد ہی کیوں نہ ہو۔ دراصل یہ لوگ سادہ لوح مسلمانوں اور عقیدتمندوں کے دین کی تباہی کے درپے ہیں۔

اگر کوئی صاحب اعتراض کرے۔ کہ تم انبیاء سے اِس فعل پر گرفت کے قائل ہو۔ جو سہواً سرزد ہو۔ یا ارادۂ خیر سے ہو مگر خلافِ رضاء الٰہی واقع ہو۔ تو بتاؤ نبی علیہ السلام سے نماز میں سہو پر جواب طلبی کیوں نہیں ہوئی۔ تو ہمارا جواب یہ ہے۔ کہ آنحضرتؐ کے تمام اگلے، پچھلے گناہ معاف ہو چکے ہیں۔ بنابریں آنحضرتؐ دیگر تمام انبیاء سے افضل واعلیٰ ہیں۔ اور اِسی فضیلت کی وجہ سے آپؐ کی قیامت کے دن شفاعت منظور ہو گی۔ جیسے کہ حدیث شفاعت میں مذکور ہے۔ لہٰذا معافی کے بعد گرفت درست نہیں

انبیاء قبل از نبوّت

کیا انبیاء قبل از بعثت معصیت کے مرتکب ہوتے ہیں؟ اس کی دو صورتیں ہو سکتی ہیں

۱۔ نبی کسی سابق شریعت کا پابند اور تابع ہو گا۔ جیسے کہ حضرت عیسیٰ علیہ السلام ۲۔ یا وہ کسی ایسی قوم میں نشو ونما پائے جس کی شریعت نسیت ونابود ہو چکی ہو۔ جیسے حضرت محمد صلی اللہ علیہ وسلم کی بعثت ایسی قوم میں ہوئی۔ جو ملت ابراہیمی کو فراموش کر چکی تھی۔ قرآن

میں ہے ۔ (وَوَجَدَكَ ضَالًّا فَهَدٰى) آپ کو شریعت
سے بے خبر پایا ۔ پھر اس کی طرف رہنمائی فرمائی ۔ دوسرے مقام پر
ہے ۔ لِتُنْذِرَ قَوْمًا مَّآ اُنْذِرَ اٰبَآؤُهُمْ ۔ تاکہ تم ان
لوگوں کو جن کے باپ دادوں کو آگاہ نہیں کیا گیا تھا ۔ آگاہ کرو ۔
لہٰذا نبی اگر کسی سابق شریعت کا پابند ہے ۔ تو وہ کبھی
معصیت کا ارتکاب نہیں کرتا ۔ اور اگر وہ کسی جاہلی دور میں
پیدا ہوا ہے ۔ تو وہ کسی شریعت کا پابند نہیں ۔ لہٰذا وہ کسی
فعل کے کرنے یا نہ کرنے میں معصیت کا مرتکب نہ ہوگا ۔
البتہ یہ امر مسلمہ اور بدیہی ہے ۔ کہ اللہ تعالیٰ نے
انبیاء کو ہر عیب سے پاک رکھا ہے ۔ اس لئے کہ عیب جوئی
ایذا رسانی ہے ۔ اور انبیاء کو اذیت پہنچانا حرام ہے
جو لوگ خدا اور اِنَّ الَّذِيْنَ يُؤْذُوْنَ اللّٰهَ وَ
اس کے پیغمبر کو رنج رَسُوْلَهٗ لَعَنَهُمُ اللّٰهُ
پہنچاتے ہیں ۔ ان پر خدا فِي الدُّنْيَا وَالْاٰخِرَةِ وَاَعَدَّ
دنیا اور آخرت میں لعنت لَهُمْ عَذَابًا مُّهِيْنًا
کرتا ہے ۔ اور ان کے لئے ذلیل کرنیوالا عذاب تیار کر رکھا ہے ۔
ہم پختہ یقین سے کہتے ہیں ۔ کہ انبیاء معاذ اللہ حرامی
والدین کی اولاد نہیں ہوتے ۔ بلکہ اللہ تعالیٰ ان کو حسب و
نسب کے اعتبار سے بہترین خاندان میں پیدا کرتا ہے ۔

بدیں وجہ ہم وثوق سے کہہ سکتے ہیں۔ کہ اللہ تعالیٰ نے انبیاء کو ہر اس عیب سے پاک رکھا ہے جس سے نبوت کے بعد نکتہ چینی ہو سکتی تھی۔ اور جملہ عیب ناک افعال، قابل شکوہ بات، اور ناقابل بیان امور سے اللہ تعالیٰ نے ان کو محفوظ و مامون رکھا ہے۔ مثلاً سرقہ وغیرہ۔

قبل از بعثت کا ایک واقعہ

رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم فرماتے ہیں۔ کہ اہل جاہلیت جو لہو ولعب کیا کرتے تھے۔ عمر بھر میں نے صرف ان کا دو بارہ ارادہ کیا۔ اور "لطف یہ" کہ دونوں دفعہ اللہ تعالیٰ نے مجھے محفوظ رکھا۔

ایک دفعہ میں نے اپنے نوجوان رفیق قریشی کو کہا (جو "اعلیٰ مکہ") میں میرے ساتھ اپنی بکریاں چرایا کرتا تھا۔ کہ میری بکریاں کا خیال رکھو۔ آج رات میں بھی شہر میں کھیل تماشہ دیکھ آؤں۔ اس نے کہا۔ بہت اچھا۔ جب میں وہاں سے چلا۔ اور مکہ کے قریب پہنچا۔ تو مجھے گانے بجانے کی آواز سنائی دی میں نے دریافت کیا۔ یہ کیا ہے؟ تو کسی نے کہا۔ کہ فلاں شخص نے ایک قریشی عورت سے نکاح کیا ہے۔ تو میں سرود کی

طرف متوجہ ہوا ہی تھا ۔ کہ اتنے میں مجھے نیند آ گئی ۔ جب دھوپ نکلی ۔ تو آنکھ کھلی ۔ پھر اپنے ساتھی کے پاس واپس چلا آیا ۔ اور ساری سرگذشت کہہ سنائی ۔

پھر دوسری دفعہ رات بھی میں اسی طرح مکہ آیا ۔ اور کھیل تماشہ میں مصروف ہوتے ہی نیند آ گئی ۔ دھوپ چمکی ۔ تو آنکھ کھلی ۔ اور پھر اپنے ساتھی کے پاس واپس چلا آیا ۔ اور اس کے دریافت کرنے پر ساری کہانی سنا دی اس نے کہا ، کچھ سنا بھی ۔ میں نے کہا ۔ کچھ نہیں ۔ پھر اس کے بعد بخدا میں نے کبھی جاہلیت کے کھیل تماشوں کا قصد نہیں کیا ۔ یہانتک کہ اللہ تعالیٰ نے مجھے نبوت سے سرفراز فرما دیا ۔

لہذا ثابت ہو گیا ۔ کہ نبی علیہ السلام نے کبھی بھی صغیرہ اور کبیرہ گناہ کا ارتکاب نہیں کیا ۔ نہ قبل از نبوت نہ بعد از نبوت البتہ صرف دو بار آنحضرت ؐ نے رات کو قصے کہانیاں ، سننے کا قصد کیا ۔ جو غالباً اس وقت ممنوع بھی نہ تھے ۔ افسانہ اور کہاوت سے بڑا مقصد بھی نہ تھا ۔ صرف تفریح طبع کا سامان مطلوب تھا ۔ اور حسین منظر کے دیکھنے کا فطری تقاضا تھا ۔ فقط باللہ التوفیق

مترجم کی دیگر کتب

۱۔ الجواب الکافی — از حافظ ابن قیم
۲۔ تاریخ تدوین حدیث
۳۔ سفر السعادت — از فیروز آبادی صاحب قاموس
۴۔ فرہنگ القراۃ الرشیدہ
۵۔ خطوط العریضہ — از محب الدین خطیب مصری
۶۔ مسئلہ نسخ
۷۔ عصمت انبیاء — از ابن حزم
۸۔ الظراف والمتماجنین — ″ علامہ ابن جوزی
۹۔ البدایہ والنہایہ (زیر طبع)

جملہ کتب کی فراہمی کے لئے ہماری خدمات حاصل کریں ۔

ہدایت اللہ ندوی ۔ مین بازار ۔ میاں چنوں (ضلع ملتا
(مکتبہ سالک ربانی میاں چنو

03335

1588

ناشر

محمد عطاء اللہ فیصل ٹاؤن میانچنوں

شرکت پرنٹنگ پریس۔ لاہور